ماهنامه

بچوں کی دنیا

دهلی

Monthly **BACCHON KI DUNIYA**, New Delhi

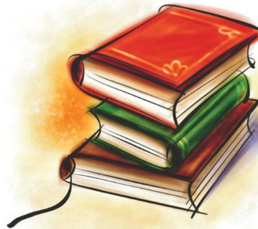
پہلا شمارہ

پہلا قدم

₹10

علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب!









ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

جلد:1، شمارہ:1 جون 2013

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

بچوں کی دنیا: 49539011

ای میل bachchonkiduniya@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7

آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040



آپس کی باتیں!

پیارے دوستو، 'بچوں کی دنیا' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ آپ کی اپنی دنیا ہے، جسے صرف آپ کے لیے بنایا اور سجایا گیا ہے۔ اس دنیا کے راجا بھی آپ ہیں پرجا بھی آپ ہیں۔ یہاں سب کو برابری کا حق حاصل ہے۔ کوئی کسی سے بڑا نہیں کوئی کسی سے چھوٹا نہیں۔ صرف رنگین چھپے ہوئے کاغذوں، چمک دار تصویروں، کہانیوں، چٹکلوں اور کارٹونوں کا نام 'بچوں کی دنیا' نہیں ہے۔ یہ دنیا آپ کے اندر بھی ہے باہر بھی ہے اور آپ کے آس پاس بھی بکھری پڑی ہے۔ اس دنیا کا دوسرا نام ہے بچپن!

بچپن ہماری وہ دنیا وہ دولت اور عمر کی وہ دہلیز ہے جو قدرت نے ہم سب انسانوں کو عطا کی ہے۔ یہ زندگی کا وہ دور ہے جو ہمیشہ ہماری یادوں میں بسا رہتا ہے۔ ماں کے ہاتھ کی سنکی ہوئی روٹیاں، والد اور ٹیچروں کی ڈانٹ ڈپٹ، بھائی بہنوں کی چھیڑ چھاڑ اور جھگڑے، دوستوں کے ساتھ کھیلنا کودنا، اس دور میں کھائے ہوئے کھانوں کے ذائقے، پڑھی یا سنی ہوئی کہانیاں، دیکھی ہوئی فلمیں، ان دنوں کی معمولی سے معمولی سیکڑوں باتیں، اور یادیں، مرتے دم تک انسان کو تڑپاتی ہیں۔ وہ آرزو کرتا ہے کہ کاش بچپن کے وہ دن کسی طرح پلٹ آئیں۔ اپنے بچپن کے ایک دن کے بدلے میں وہ اپنی باقی ساری زندگی دینے کو تیار ہو جاتا ہے، مگر جو عمر ایک بار چلی جاتی ہے پھر واپس نہیں آتی۔ اردو کے عظیم شاعر میر انیس نے کیا خوب کہا ہے:

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

آپ خوش قسمت ہیں کہ بچپن کے اس دور سے گزر رہے ہیں، جسے انسانی زندگی کا سب سے سنہرا دور Golden Period کہا جاتا ہے اور جس کو انسان زندگی بھر ترستا ہے۔ ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' آپ کے بچپن کی دنیا کو اور بھی حسین بنانے کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے جو امید ہے آپ کو ضرور پسند آئے گی۔ ہم آپ کو آپ کا ہی بچپن پیش کر رہے ہیں۔ اس میں مزے دار قصے کہانیاں ہیں، کارٹون ہیں، کامکس ہیں، دل چسپ معلوماتی مضمون ہیں، حیرت انگیز چیزوں کا بیان ہے، دنیا بھر میں بے حد شوق سے پڑھے گئے ایک ناول کی قسط وار شروعات ہے، پیاری پیاری نظمیں ہیں، 'اردو فیس بک' کے عنوان سے آپ کا اپنا کالم ہے، 'نانی کے صندوق سے' نکالی گئی وہ پرانی نظمیں، کہانیاں، اور چٹکلے ہیں، جنھیں ہر دور کے بچوں نے بہت پسند کیا ہے۔ ان دنوں گرمیوں کی چھٹیاں ہیں تو کھیل کود اور سیر و تفریح سے فرصت ملنے کے بعد یہ سب چیزیں بھی پڑھیے اور کھل کر بتائیے کہ کیا اچھا لگا، کیا اچھا نہیں لگا اور کس چیز کی کمی ہے۔ آپ کے خط آپ کی تصویر کے ساتھ چھاپے جائیں گے۔ اور ہاں، آپ ہم سے معلوماتی سوالات بھی کر سکتے ہیں۔ اگلے شمارے سے 'میاں بقراطی' کسی بھی موضوع پر آپ کے سوالات کا جواب دینے کے لیے ابھی سے تیار بیٹھے ہیں۔ آپ کی ان سے باقاعدہ ملاقات کرائی جائے گی، اور مجھے پورا یقین ہے کہ آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ بس قلم اٹھا کر اپنے ذہن میں کلبلانے والا کوئی بھی سوال ہمیں لکھ بھیجیے۔

آخر میں صرف اتنا کہ آج کل گرمی بہت پڑ رہی ہے۔ اپنی صحت کا خیال ضرور رکھیے۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

اسنیٰ بدر

اچھی اردو پیاری اردو

اچھی اردو پیاری اردو
کچھ دیر تو مجھ سے بات کرو

جو نیل گگن سے آئی ہو
تو روشن میری رات کرو
جو کومل سندر لڑکی ہو
تو دل اپنا سوغات کرو
جو بازی رکھو چاہت کی
تم جیتو ہم کو مات کرو

ان پھیکے پھیکے لفظوں پر
سب بے جا خوب اکڑتے ہیں
سب جانتے ہیں ، تم بولتی ہو
تو پھول لبوں سے جھڑتے ہیں
سب اپنے ادھورے جملوں میں
یہ ہیرے موتی جڑتے ہیں
سب تم سے آنکھ ملاتے ہیں
سب پاؤں تمہارے پڑتے ہیں

ہم نے تو یہی دیکھا ہے یہاں
جو تم نے کہا وہ ریت بنا
ہم تو یہی سمجھا ہے یہاں
سر تم نے دیے سنگیت بنا
ہم نے تو یہی جانا ہے یہاں
تم سے ہی کوی من میت بنا

نظموں نے ہمیں چوما بڑھ کر
اور میٹھا سچا گیت بنا

لیکن یہ تمہاری قسمت ہے
ہاتھ آئی ہے ایسی تنہائی
پھرتی ہو کہیں ماری ماری
جو ملتا ہے سو ہرجائی
ہر روز کے دھوکیراہوں میں
ہر روز جبیں پر رسوائی
ہر روز ذرا سی خوش فہمی
ہر روز کی محفل آرائی

جب دنیا کے ان میلوں سے
تھک جاؤ تو میرے پاس آنا
جب اوروں کی بانہوں سے کبھی
اکتاؤ تو میرے پاس آنا
میں بڑھ کر نذر اتاروں گی
گھبراؤ، تو میرے پاس آنا
مرہم سے نہیں بھر پائے اگر
یہ گھاؤ، تو میرے پاس آنا

اچھی اردو پیاری اردو
اچھی اردو پیاری اردو

Asna Badr,
Riyadh, Saudi Arabia



ہانگ کانگ میں گوتم بدھ کا بہت بڑا بت

■ نصرت ظہیر

ڈھائی ہزار سال سے بھی پرانا مذہب!

بدھ دھرم

عزیز دوستو ہماری دنیا میں بہت سے مذہب ہیں جنھوں نے کئی طرح سے دنیا پر اور اس میں رہنے والوں پر اپنا اثر ڈالا ہے۔اس دنیا کو اچھی طرح جاننے اور اس کے الگ الگ علاقوں کی تاریخ اور تہذیب کو سمجھنے کے لیے مذہبوں کو جاننا بہت ضروری ہے۔ بڑے ہو کر آپ کو کالج اور یونی ورسٹیوں میں مذہبوں کے بارے میں زیادہ جاننے کا موقع ملے گا۔لیکن اگر آپ چھوٹی عمر میں ہی دنیا کے بڑے مذہبوں کے بارے میں اہم باتیں جان جائیں تو یہ معلومات آگے چل کر آپ کے کام آئے گی اور بہت سی الجھی ہوئی باتوں کو سمجھنے میں بھی آسانی ہو گی۔ اس کے علاوہ آپ کے ساتھی بھی آپ کے علم سے حیران رہ جائیں گے ۔یاد رکھئے ، علم ہمیشہ کام آتا ہے ، اور آپ کا علم بڑھانے کے لیے ہی ہم یہ سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ اسے پڑھکر ہمیں اپنی رائے ضرور لکھیے۔ مدیر

بدھ مت دنیا کے بڑے مذہبوں میں سے ایک ہے جس کے ماننے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔صحیح تعداد کیا ہے یہ یقین سے کہنا مشکل ہے ۔ وجہ یہ کہ بدھ مذہب دنیا کے بہت سے ملکوں میں خاص طور سے مشرق کے ایسے کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے جہاں بہت پرانے مذہبوں کے پیروکار بھی اس مذہب میں عقیدت رکھتے ہیں اور عبادت کے طریقے ملتے جلتے ہونے کی وجہ سے انھیں بھی بودھ یا بدھ مذہب کو ماننے والا سمجھ لیا جاتا ہے۔ چاہے وہ کنفیوشس سے وابستہ مذہب کے ماننے والے ہوں، یا چین کے شِن تو مذہب، اور کوریا کے 'می یوٗ' یا 'شنگ یوٗ' مذہبوں کے پیروکار ہوں، انھیں اصل بدھ مت سے الگ کرنا مشکل ہے۔یہی وجہ ہے کہ کئی لوگ دنیا بھر میں بودھوں کی تعداد 37 کروڑ بتاتے ہیں تو کئی دوسروں کے حساب سے یہ آبادی ایک ارب 70 کروڑ تک ہوسکتی ہے۔ یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں سے بھی زیادہ!

بدھ مت یا بدھ ازم Buddhism ڈھائی ہزار سال سے بھی پرانا مذہب ہے۔ یعنی عیسائی مذہب سے بھی پرانا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس مذہب کی بنیاد ہندوستان میں پڑی اور اشوک اعظم اسی مذہب

کو ماننے والا سب سے بڑا بادشاہ تھا لیکن ہندوستان میں آج اس مذہب کو ماننے والوں کی تعداد صرف اسّی 80 لاکھ ہے اور ان میں بھی 50 لاکھ بودھ مہاراشٹر میں ہیں جنھوں نے بابا بھیم راؤ امبیڈکر کی تحریک پر اس مذہب کو قبول کیا تھا۔ جن ملکوں میں بودھوں کی اچھی خاصی آبادی ہے ان میں جاپان، چین، کوریا، منگولیا، ویت نام، تھائی لینڈ، برما، تبت، نیپال اور سری لنکا شامل ہیں۔

بدھ مت کی بنیاد گوتم بدھ نے رکھی تھی جن کا اصلی نام سدھارتھ گوتم تھا۔ سدھارتھ، راجہ سدّ ودھن کے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ کا نام مہا مایا دیوی تھا اور جب وہ اپنے میکے جا رہی تھیں تو لمبنی کے مقام پر گوتم بدھ کی پیدائش ہوئی تھی۔ لمبنی بہار کی سرحد پر موجودہ نیپال کے علاقے میں ہے۔ کسی جیوتشی نے بتایا کہ بڑا ہو کر یہ بچہ یا تو سنیاسی ہو جائے گا یا بڑا بادشاہ بنے گا۔ والد راجہ سدّ ودھن نے سدھارتھ گوتم کو راجہ بنانے کے لیے ایسا محل بنوایا جہاں ہر طرح کے آرام اور عیش کے سامان اور نوکر چاکر موجود تھے تاکہ گوتم رات دن عیش و آرام میں ڈوبے رہیں اور سنیاسی بن کر دنیا کا ہر آرام چھوڑ دینے کا خیال ان کے دل میں نہ آئے۔ والد نے گوتم کو محل سے باہر لے جانے پر بھی پابندی لگا دی۔

لیکن سدھارتھ گوتم کا دل رنگ رلیوں میں نہ لگا۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے ان کے مزاج میں سنجیدگی آتی گئی۔ وہ ہر دم کسی نہ کسی غور و فکر میں ڈوبے رہتے۔ یہ دیکھ کر والد نے سولہ برس کی عمر میں ان کی شادی ایک ہم عمر شہزادی یشودھرا سے کر دی۔ لیکن اس سے بھی گوتم کی عادتیں نہ بدل سکیں۔ وہ ہر وقت زندگی کی حقیقت کو سمجھنے اور اس کے راز جاننے کی دھن میں لگے رہتے۔ مگر ان کے محل سے باہر جانے پر پابندی تھی۔ ایک رات انھوں نے اپنے رتھ بان کو محل سے باہر شہر لے چلنے پر مجبور کر دیا اور کہتے ہیں کہ کئی رات وہ اسی طرح محل سے باہر جاتے رہے۔ اس دوران انھوں نے ایک بوڑھے کو، ایک بیمار کو اور ایک جنازے کو دیکھا جس سے یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی کہ دنیا میں کچھ بھی ہمیشہ ایک جیسا رہنے والا نہیں ہے۔ جو جوان ہے وہ بوڑھا ہو جاتا ہے، جو صحت مند ہے وہ بیمار پڑ جاتا ہے اور جو زندہ ہے وہ مر



چین میں دنیا کا سب سے اونچا 128 میٹر کا گوتم بدھ کا مجسمہ

جاتا ہے۔ اس کے بعد جس روز ان کا بیٹا راہل پیدا ہوا اسی رات انھوں نے محل چھوڑ کر سنیاس لے لیا۔ اپنا شاہی لباس رتھ بان کو سونپ کر انھں نے ایک چرواہے سے اس کا لباس مانگ کر پہنا اور جنگل کے اندھیرے میں کھو گئے۔ اس وقت ان کی عمر 29 سال تھی۔

زندگی کی حقیقت کو جاننے کے لیے وہ عالموں سے علم حاصل کرنے لگے۔ لیکن اس زمانے کا ہر علم حاصل کرنے پر بھی ان کی تسلّی نہ ہوئی۔ ان دنوں یہ خیال عام تھا کہ روحانی ترقی کے لیے اپنے جسم کو تکلیف پہنچانا ضروری ہے۔ گوتم نے بھی یہ طریقہ آزمایا، موجودہ بہار میں 'گیا' پہنچ کر انھوں ایسی فاقہ کشی کی ان کا بدن سوکھ کر ہڈیوں کا پنجر رہ گیا اور انھیں لگا کہ اب وہ مر جائیں گے، لیکن ہمیشہ قائم رہنے والی خوشی کا گیان پھر بھی نہیں ملے گا۔ اپنی تلاش ناکام ہو جانے کے خیال سے انھوں نے ایک چرواہن کی نذر کی ہوئی کھیر کھا کر برت توڑ دیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے دھیان لگا کر بیٹھ گئے

اور طے کرلیا کہ جب تک 'ابدی خوشی' کا راز نہیں ملے گا تب تک اسی طرح بیٹھے رہیں گے اور مرجائیں گے۔ کہتے ہیں کہ رات کے پہلے پہر اپنے مراقبے اور دھیان کے دوران انھیں وہ گیان مل گیا جس کی انھیں تلاش تھی اور رات کے پچھلے پہر میں 'نروان' کی صورت میں نجات کا وہ راستہ بھی مل گیا، جس کا دوسرا نام 'ہمیشہ رہنے والی خوشی' یا ابدی مسرت ہے۔ یوں گوتم سدھارتھ سے وہ گوتم بدھ ہو گئے۔اس کے بعد وہ دنیا بھر میں اپنے خیالات کی تبلیغ کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ 35 سال کی عمر میں نروان حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اپنی باقی عمر کے 45 سال تبلیغ میں ہی گزارے۔آخر 80 سال کی عمر میں آج کے اتر پردیش میں وارانسی سے 120 میل دور کُسی نارا کے مقام پر انھوں نے آخری سانس لی اور بودھ عقیدے کے مطابق مہا پری نروان حاصل کیا۔

کئی لوگوں کے نزدیک بدھ دھرم کوئی مذہب نہیں بلکہ فلسفہ ہے۔ مذہبی طور پر اس کی تعلیمات کی بنیاد چار مقدس سچائیوں پر ہے۔مختصر اور



بہار کے ضلع گیا کا مشہور بودھ مندر



بہار کے ضلع گیا میں گوتم بدھ کا عظیم مجسمہ

عام لفظوں میں پہلی سچائی یہ ہے کہ زندگی دکھ ہے۔ دوسری یہ کہ، دکھ کا سبب ہے خواہش اور بے زاری۔ تیسری یہ کہ، گزرے ہوئے کل اور آنے والے کل سے بے نیاز ہو کر آج کو بہتر بنانے سے دکھ پر قابو پایا جاسکتا ہے اور سچّی مسرت حاصل ہوتی ہے جس سے دوسروں کی مدد کے لیے وقت اور توانائی مل جاتی ہے اور یہی نروان ہے۔ چوتھا مقدس سچ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آٹھ مقدس راستوں پر چل کر دکھوں کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے اور یہ آٹھوں راستے عام زندگی میں پاکیزگی، دوسروں کی خدمت، رحم دلی، قربانی وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کی تعلیم تقریباً ہر مذہب دیتا ہے۔

بدھ مذہب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ باقی مذہبوں کی طرح اس میں خدا کا کوئی تصور نہیں ہے اور خدا کی عبادت بھی نہیں ہوتی۔ گوتم بدھ بھی خود کو خدا نہیں کہتے تھے۔ کائنات میں جتنی چیزیں موجود ہیں ان کے آپس کے تعلق پر اس مذہب میں زیادہ زور دیا گیا ہے۔ لفظ بدھ، 'بدھی' یا عقل یعنی بیداری سے آیا ہے۔ دنیا بھر میں جگہ جگہ گوتم بدھ کے اتنے بُت بنائے گئے ہیں کہ فارسی میں بدھ کے لفظ کو بُت یا مورتی کے معنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ بودھ مندروں میں بودھ لوگ بدھ کی مورتی کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اپنے احترام کا اظہار کرتے ہیں اور اسی کے لیے انھیں بھگوان بدھ کہتے ہیں۔

■ **NusratZaheer**, C280, Shaheen Bagh,
Jamia Nagar New Delhi- 110025



■ عقیل شاطر انصاری

میرا وطن

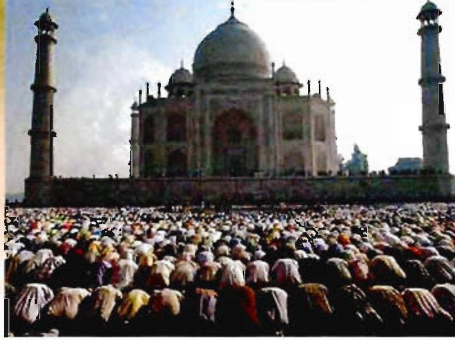
مری جان ہے میرا ایمان ہے
جدا سب سے بھارت کی پہچان ہے

کہیں شہر ہے تو کہیں گاؤں ہے
بلندی پہ لیکن ہر اک پاؤں ہے
جہاں دیکھو تم پیار کی چھاؤں ہے
یہی سب کی عزت، یہی شان ہے

نشیمن کسی کا جلاتی نہیں
یہاں دھوپ نفرت کی آتی نہیں
خزاں بھی کسی کو ستاتی نہیں
یہاں پر بہاروں کی اک شان ہے

جسے دیکھیے خوش ہے مسرور ہے
زمانے میں یہ بات مشہور ہے
ترا غم، مرا غم یہ دستور ہے
زمانہ اسی پر تو حیران ہے

بہاروں کی مانند رنگِ چمن
ہر ایک دل محبت کا گنگ و جمن
یہاں سب کے سب آبروئے وطن
وطن پر جسے دیکھو قربان ہے









حسد کا کہیں پر نہ نام و نشاں ہے
نہ نفرت کا دریا کہیں پر رواں ہے
خلوص و محبت کا ارماں جواں ہے
لبوں پر یہاں سب کے مسکان ہے

کبھی دشمنوں کی، کبھی دوستوں کی
کبھی بے بسوں کی، کبھی بے کسوں کی
بدلتی ہے قسمت یہاں مفلسوں کی
یہاں اب بھی انسان، انسان ہے

ہمارے دلوں میں کدورت نہیں ہے
کہیں کوئی مظلوم صورت نہیں ہے
کہ رونے کی ہم کو ضرورت نہیں ہے
اسی پر زمانہ بھی حیران ہے

جدا سب سے بھارت کی پہچان ہے
مری جان ہے میرا ایمان ہے

■ **Aqeel Shatir Ansari,**
80 Pujari Ki Chawl
Ahmedabad

■ راشد جمال فاروقی

چاکلیٹ، چاکلیٹ، چاکلیٹ...

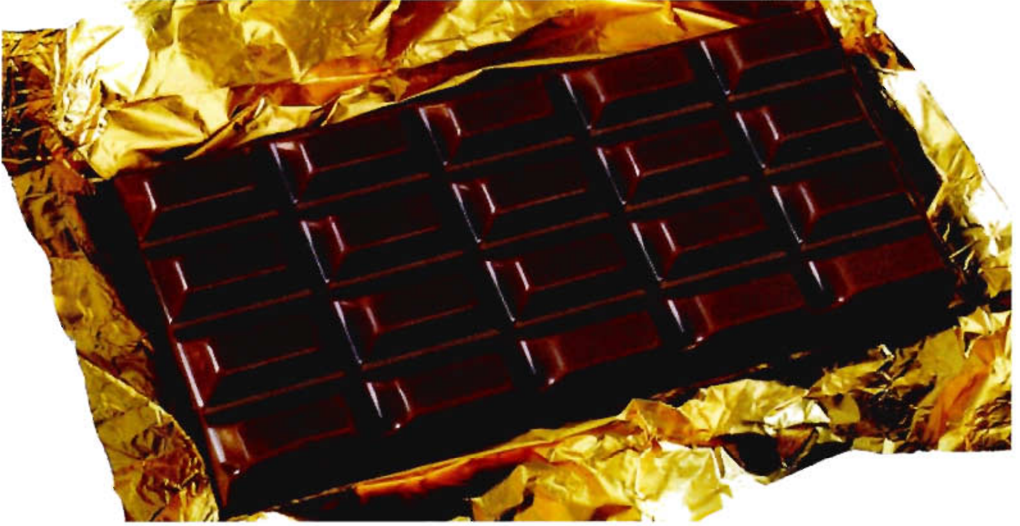
یہ ہے کہانی چاکلیٹ کی!

چاکلیٹ کھانا کس کو اچھا نہیں لگتا۔ کیا چھوٹے کیا بڑے۔ کوئی بھی موقع ہو۔ اگر تحفے کے طور پر چاکلیٹ مل جائے تو کیا کہنے! چاکلیٹ کا نام سنتے ہی منھ میں پانی آ جاتا ہے۔ تو آیئے آج چاکلیٹ کی پوری کہانی جانتے ہیں۔

مغربی افریقہ، ویسٹ انڈیز اور جنوبی امریکہ کے ساحلی علاقوں میں ایک پیڑ پیدا ہوتا ہے، جس کا نام ہے کاکاؤ Cacao۔ اس پیڑ سے کوکو Coco حاصل کیا جاتا ہے۔ اسی کوکو سے چاکلیٹ بنتی ہے۔ یہ پیڑ بڑا نازک ہوتا ہے اس لیے اس کی بہت دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ سیدھی دھوپ اور تیز ہوا سے بچانے کے لیے ان پیڑوں کو بڑے پیڑوں کی آڑ میں پالا جاتا ہے، تب جا کر یہ پھل دیتے ہیں۔ ان کی عمر 60 برس ہوتی ہے۔



اس پیڑ کے تنے پر پھول آتے ہیں شاخوں پر نہیں۔ پھول کے بعد ایک دس انچ لمبی پھلی تیار ہوتی ہے۔ یہ پھلی چھ مہینوں میں پک کر تیار ہوتی ہے۔ ایک پھلی میں 20 سے 40 تک بیج ہوتے ہیں۔ پک جانے پر یہ پھلیاں پیڑ سے کاٹ کر الگ کر لی جاتی ہیں، اور انھیں تیز دھوپ میں سکھایا جاتا ہے تو بیج کے اوپر چڑھا ہوا سفید مادہ پگھل کر اتر جاتا ہے، اور گہرے چاکلیٹی رنگ کے یہ بیج چاکلیٹ تیار کرنے والی فیکٹریوں کو بھیج دیے جاتے ہیں۔ فیکٹریوں میں ان کی صفائی کی جاتی ہے اور گھومتے ہوئے چولہوں میں انھیں بھونا جاتا ہے تو یہ ٹوٹ جاتے ہیں اور پھر ان کا چھلکا تیز ہوا کے ذریعے الگ کر لیا جاتا ہے۔ اب 'نب' Nib نام کا مادہ ہاتھ آتا ہے۔ اس نب میں 54 فی صد چکنائی پائی جاتی ہے۔ نب کو رولروں کے درمیان



سے گزار کر چکنائی الگ کی جاتی ہے۔ پھر اس چکنائی کو بڑی سی پریس سے ہوکر گزارا جاتا ہے جہاں یہ سخت کیک کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اب اس سخت کیک کو کچل کر چھانا جاتا ہے اور اس طرح کوکو پاؤڈر حاصل ہوتا ہے۔ اس پاؤڈر میں شکر اور دودھ ملا کر پیسٹ Paste تیار کرتے ہیں۔ ونیلا Vanilla وغیرہ کے ذائقے ملائے جاتے ہیں اور اس پیسٹ کو مشینیں پتلی سوکھی پرت میں بدل دیتی ہیں۔

بعد میں بڑے برتنوں میں گرینائٹ Granite کے رولروں سے گزر کر یہ شاندار لذیذ رقیق تیار ہوتا ہے جسے سانچوں میں بھر کر وہ چاکلیٹ بار تیار کی جاتی ہے جسے دیکھتے ہی ہم سب کے منھ میں پانی بھر آتا ہے۔



چاکلیٹ میں وٹامن بی B کے علاوہ بہت سے معدنیات Minerals اور کافی کیلوریز Calories بھی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کا بھی حد سے زیادہ استعمال اچھا نہیں ہوتا، کیونکہ کیفین Caffine نامی نقصان دہ مادہ بھی چاکلیٹ میں موجود ہوتا ہے۔

16 ویں صدی عیسوی میں کولمبس جب امریکہ پہنچا تو اس نے وہاں کے ایزٹیک Aztec باشندوں کو چاکلیٹ کا لذیذ مشروب پیتے دیکھا۔ یہ لوگ اس میں کئی مسالے اور سیاہ مرچ ملا کر پیتے تھے۔ کولمبس اس شربت کو اسپین لے آیا۔ اسپین والوں نے کالی مرچ کی جگہ شکر ملانے کی شروعات کی اور تقریباً سو سال تک اس مشروب کو راز میں رکھا۔ 17 ویں صدی میں چاکلیٹ فرانس اور یوروپ کے دوسرے ملکوں تک پہنچی۔

برطانیہ کے لوگوں نے اس میں دودھ ملا کر پینا شروع کر دیا۔ اس طرح اس مشروب کی لذّت میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اور بالآخر 1876 میں سوئٹزر لینڈ کے باشندوں نے اس میں دودھ اور شکر ملا کر اسے ٹھوس شکل دی جو آج تک رائج ہے اور دنیا بھر کے ملکوں کی سرحدیں توڑ کر سب کی پسندیدہ چیز بنی ہوئی ہے۔

■

Rashid Jamal Faruqi , C-1452-IDPL-Township
Virbhadra, Rishikesh UK-249202

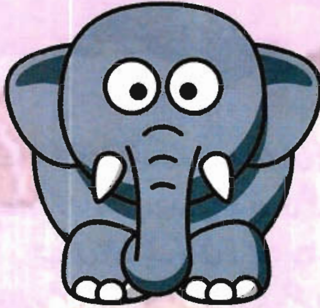


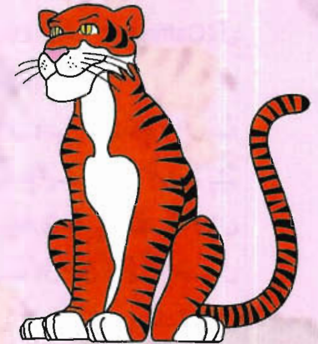
■ محسن باعشن حسرت

چڑیا گھر کی سیر

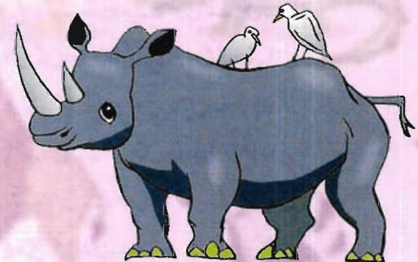


چلو چلیں سب چڑیا گھر کو
دیکھیں چل کر شیر ببر کو
بلو، شمسی، چنو آؤ
پپو، شیلی، منو، آؤ
اک لائن میں سب آجاؤ
اپنا اپنا ٹکٹ کٹاؤ
رہنا ہر کوئی ہاتھ پکڑ کر
الگ نہ ہونا کہیں جھگڑ کر
ہاتھی کا دیدار بھی کرنا
اونٹ سے آنکھیں چار بھی کرنا
دیکھو بندر شور مچائے
اچھلے، کودے، ناچے گائے
مور کو دیکھو پر پھیلائے
اپنے پروں سے سب کو لبھائے
پیاری چڑیا اڑتی جائے
چیں چیں، چیں چیں کرتی جائے
تپلی، لمبی ٹانگوں والا
یہ ہے بچو ایک زرافہ
مرغی بھی ہے، مرغا بھی ہے
اک پنجرے میں طوطا بھی ہے

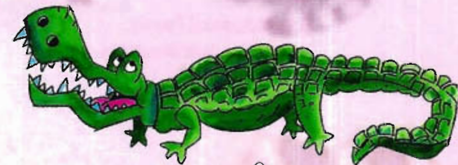




چیتے اور گھڑیال کو دیکھو
طاقتور ہے کتنا سوچو
گینڈا پانی میں اترا ہے
بن مانس بھی اچھل رہا ہے
کھیلو، کودو، ناچو، گاؤ
دوڑو، بھاگو، دھوم مچاؤ
گیند ہوا میں خوب اچھالو
تھک جاؤ تو پھر سستالو
بھوک لگے تو کھالو، پی لو
عیش کرو، مستی میں جی لو
شام ہوئی اب گھر کو جاؤ
سارے دن کی تھکن مٹاؤ



■ Mohsin Baeshin Hasrat
4,Princep Street, Ist Floor, Kolkata-700072





رضا جعفری

آؤ چڑیا گھر چلیں

چھٹّی کا دن تھا۔ چڑیا گھر کے پھاٹک پر بھیڑ جمع تھی۔ بچوں کا رزلٹ آئے دو دن ہو گئے تھے۔ وعدے کے مطابق وہ بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئے تھے اور میں انعام کے طور پر انھیں چڑیا گھر دکھانے لایا تھا۔

چڑیا گھر کے اندر میلے کا سا سماں تھا۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس ہر طرف بچے ہی بچے نظر آرہے تھے۔ کچھ بہت چھوٹے بھی تھے جن کو ان کے والدین نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔ بڑی عمر کے ہر طرف شرارتیں کرتے گھوم رہے تھے۔ کٹہروں میں بند جانوروں کو دیکھ کر طرح طرح کی آوازیں نکال رہے تھے۔ کچھ بچے شور مچا رہے تھے اور تالیاں بجا کر جانوروں کی نقل اتار رہے تھے۔

چڑیا گھر کی ریل چلنے کو تیار کھڑی تھی۔ ٹکٹ لے کر ہم پلیٹ فارم پر آئے اور ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ گارڈ نے جھنڈی ہلائی، انجن نے سیٹی دی اور ہماری ریل روانہ ہوگئی۔ ریل ایسے راستوں سے ہوکر گذر رہی تھی جہاں سے چڑیا گھر میں دور تک پھیلے جانوروں کے کٹہروں کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ ڈبے میں کچھ بڑی عمر کے بچے بھی بیٹھے تھے۔ وہ جانوروں کو دیکھتے ہی بے قابو ہو جاتے۔ کبھی ڈبے کے پائیدان پر پیر رکھ کر کھڑے ہو جاتے، کبھی جانوروں کی طرف کوئی پتھریلی چیز پھینکتے۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ بری بات ہے۔ کچھ بچے تو مان گئے مگر زیادہ تر بچے اسی طرح کی حرکتیں کرتے رہے۔ پورے چڑیا گھر کا چکر لگا کر ہماری ٹرین سیٹی بجاتی ہوئی واپس اسی پلیٹ فارم پر لوٹ آئی۔

اب ہم جانوروں کو قریب سے دیکھنے کے لئے ان کے کٹہروں کی طرف چلے۔ ایک کٹہرہ میں ہرن سو رہا تھا۔ کچھ بچے پتھر مار کر اسے جگانے لگے۔ دوسرے کٹہرے میں بارہ سنگھا اسی طرح کھڑا تھا جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ بچے اسے بھی چھیڑنے لگے۔ ریچھ کے کٹہرہ میں ایک کوٹھری بھی تھی۔ وہ بار بار کوٹھری کے اندر باہر آجا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مسئلہ کا حل ڈھونڈ رہا ہو۔



بندر اور لنگور بندروں کے کٹہروں کے پاس میں سب سے زیادہ بھیڑ تھی۔ کوئی ان کی طرف کیلے پھینک رہا تھا اور کوئی امرود مار کر انھیں چھیڑ رہا تھا۔ کچھ بڑی عمر کے لوگ ایسے بھی تھے جو اُن کی طرف جلتی ہوئی سگریٹیں پھینک کر اشاروں سے انھیں سگریٹ پینا سکھا رہے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی لنگور یا بندر ان کی نقل اتار دیتا یا سگریٹ پینے لگتا تو وہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگتے۔



چڑیا گھر کے بیچ میں بنے ہوئے بڑے سے تالاب میں ہزاروں چڑیاں قید تھیں۔ پورے تالاب کو بڑے سے جال سے ڈھک دیا گیا تھا۔ میں نے بچوں کو دکھایا۔ اس جال کے اوپر اور آس پاس بھی اتنی ہی چڑیاں تھیں جتنی جال کے اندر۔ جال کے اندر کی چڑیاں کسی قیدی کی طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی اسی کے اندر گھوم رہی

تھیں۔ جبکہ جال کے باہر کی چڑیاں آزادی سے چاروں طرف اپنے نغمے بکھیر رہی تھیں۔ شاید انھیں امید تھی کہ جال میں بند چڑیاں بھی ایک دن ان کی طرح آزاد ہو جائیں گی۔

اتنا گھومنے کے بعد بچے تھک گئے تھے۔ مگر دور سے آرہی شیروں کی دہاڑ نے کی آواز نے ان کے اندر ایک نیا جوش بھر دیا۔ وہ شیروں کو دیکھے بغیر گھر جانا نہیں چاہتے تھے۔ ہم شیروں کے کٹہروں کی طرف بڑھے تو دور سے ہی بدبو کے بھبکے آنے لگے۔ شاید وہاں ٹھیک سے صفائی نہیں ہوئی تھی۔

یہ شیروں کے کھانا کھانے کا وقت تھا۔ وہ بھوکے ہورہے تھے۔ اسی لئے زور زور سے دہاڑ رہے تھے۔ چڑیا گھر کے ملازم گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے ان کے پاس پہنچا رہے تھے۔ شیروں کو دیکھنے کے لئے بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔ چڑیا گھر کے ملازموں نے سب کو سمجھایا۔ ''یہ شیروں کے کھانے کا وقت ہے۔ اس وقت ان کو مت چھیڑو'' مگر ان کی بات کسی نے نہیں سنی۔ کوئی سیٹی بجا کر ان کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا کوئی سوکھی ڈال اندر پھینک رہا تھا، کوئی طرح طرح کی آوازیں نکال رہا تھا۔

پاس کے کٹہرہ میں ایک سفید رنگ کی خوبصورت شیرنی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ وہاں بھی چاروں طرف لوگ











کھڑے تھے اور ان کو پریشان کر رہے تھے۔ شیرنی رہ رہ کر دہاڑ رہی تھی۔ سب کو اس کی آواز سن سن کر بہت مزا آرہا تھا۔

اسی وقت ایک دردناک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کچھ سمجھنے کا موقعہ بھی نہیں ملا۔ نہ جانے کس طرح ایک چھوٹی سی بچی نے شیرنی کے کٹہرے کے اندر اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ شیرنی اپنی جگہ سے بجلی کی طرح اچھلی مگر اس سے پہلے کہ وہ اس بچی کو زخمی کرتی چڑیا گھر کے ایک ملازم نے جو پاس ہی کھڑا تھا بچی کو اپنی طرف کھینچ لیا اور بچی بچ گئی۔

ہم لوگ دور کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بچے اتنا گھبرائے کہ مجھ سے لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد میرا بیٹا بولا ''پاپا! آپ ٹھیک کہہ رہے تھے، یہاں آنے والے لوگ جانوروں کو بہت چھیڑتے اور ستاتے ہیں۔ نہ انھیں وقت پر کھانے دیتے ہیں اور نہ آرام کرنے دیتے ہیں۔ اسی لئے یہ جانور اتنے غصے میں رہتے ہیں۔''

''ہاں بیٹا!'' میں نے سمجھایا ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، جانور اور پرندے بھی ہماری ہی طرح ہوتے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں تو وہ ہم کو کبھی نقصان نہیں پہنچاتے۔ وہ تو آدمی کے بہت اچھے اور بہت پرانے دوست ہیں۔'' چڑیا گھر کے جانوروں اور پرندوں کی باتیں کرتے ہوئے ہم بڑے پھاٹک سے باہر آگئے۔

■

Raza Jafri, 178/50 Maqbara
Gola Ganj Lucknow-226018

■ محبوب حسن ہمدم

کتابوں کا بدل کوئی نہیں ہے!

کتنی پیاری چیز ہوں میں
کتنی نیاری چیز ہوں میں
بھٹکے کو میں راہ دکھاتی
سب کے دلوں کو ہوں میں بھاتی
نفرت کو میں دور بھگاتی
سب کے من میں آس جگاتی
گھر ہو چاہے ہو اسکول
ہر جا مجھ سے کھلتے پھول
ہر مذہب سے رشتہ میرا
دام ہے کتنا سستا میرا
گرو گرنتھ ،انجیل، قرآن
گیتا ہو یا وید پُران
ہندو مسلم سکھ عیسائی
میری نظر میں بھائی بھائی

ہر طبقے سے چاہت مجھ کو
بچوں سے ہے راحت مجھ کو
بھید بھاؤ سب دور بھگاتی
سب کو اپنے پاس بلاتی
بات پتے کی کہتی ہوں میں
غم سب کا ہی رکھتی ہوں میں
پریوں کی بھی کہانی مجھ میں
بات بڑی یہ سہانی مجھ میں
بچے بوڑھے اور جوان
بڑھتی مجھ سے سب کی شان
دیمک میڈم تم مت کھانا
بات مری یہ بھول نہ جانا
مانو ہمدم کی یہ بات
رکھو مجھ کو ہر دم ساتھ

■ Mahboob Hasan Hamdam ,131-E,
Brahmputra Hostel JNU New Delhi-110067

■ صدر عالم گوہر

کتابوں کو بنالو دوست اپنا
اسی سے سچ تمہارا ہوگا سپنا
ان ہی سے زندگی میں رنگ بھرلو
ان ہی کے ساتھ بیٹھو اور کھیلو
ہوئے جتنے ہیں دانشور ہمارے
بڑھے آگے کتابوں کے سہارے
کتابیں تم سے ہنستی بولتی ہیں
جو راہیں بند ہیں وہ کھولتی ہیں
کتابوں سے جو تم بھرلو گے دامن
تو پھر دنیا میں ہوگا نام روشن
کتابوں سے خدا کو ہے محبت
کتابیں کیں رسولوں کو عنایت
کتابوں سے تم اپنا ناطہ جوڑو
کتابوں سے کبھی بھی منہ نہ موڑو

■ Sadr e Alam Gaugar ,Pursaulia, via Jay
Nagar , Madhubani Bihar -847226

پھسلن

حسن جمال

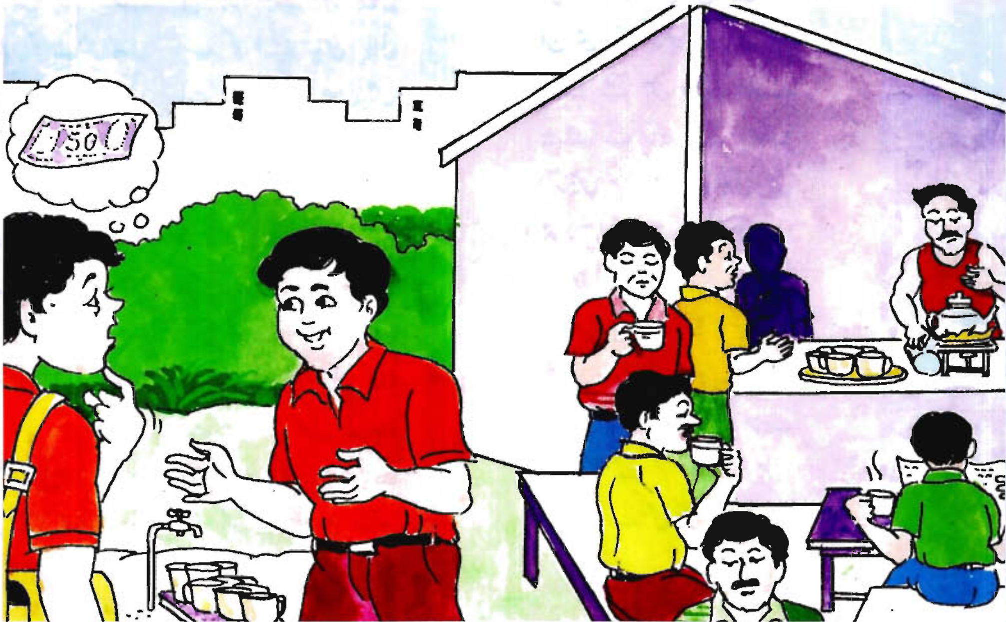
حمید نے اپنے دوست سجاد عرف سنجو کو دو دن اسکول میں نہیں دیکھا تو سوچا، اس کے گھر میں کچھ کام ہوگا یا پھر طبیعت کچھ خراب ہوگی۔ لیکن وہ پورے ایک ہفتہ تک اسکول نہیں آیا، تو حمید کو فکر ہونے لگی۔ وہ دونوں چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ دونوں میں خوب گھٹتی تھی۔

اسکول سے چھٹی ہونے پر حمید سنجو کے گھر گیا۔ وہ گھر پر بھی نہیں تھا۔ اس کی امی نے بتایا کہ وہ اسکول سے نہیں لوٹا۔ حمید کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ سنجو ضرور کسی چکر میں ہے۔ معلوم کرنا چاہئے۔ اس نے سنجو کی امی کو یہ نہیں بتایا کہ وہ ایک ہفتے سے اسکول نہیں آ رہا ہے۔ اگر بتا دیتا تو امی فکرمند ہو جاتیں۔

سنجو کو تلاش کرنے کے لیے حمید ادھر ادھر گھومنے لگا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ جانے کہاں غائب ہوگیا! اسے سنجو پر غصہ بھی آنے لگا۔ اگر وہ اس کا دوست ہے تو اسے بھی تو ملنے آنا چاہئے تھا۔ اگر وہ کسی مصیبت میں ہے تو اسے بتانا چاہئے تھا۔

ایک دن حمید اپنے ایک رشتے دار کو وداع کرنے کے لئے ریلوے اسٹیشن گیا تو اسٹیشن روڈ پر اچانک اس کی نگاہ سنجو پر پڑی۔ وہ چائے کی ایک تھڑی پر اکڑوں بیٹھا، گندی سی جگہ پر چائے کے جوٹھے کپ گلاس دھو رہا تھا۔ وہاں دو تین بینچیں رکھی ہوئی تھیں، جن پر طرح طرح کے لوگ بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ کچھ کھڑے بھی تھے اور بیڑی سگریٹ پھونک رہے تھے۔ چائے والا 'سیٹھ' قمیص اتارے صرف بنیان پتلون میں اسٹوو کی لو کبھی تیز، کبھی مدھم کرتے ہوئے چائے ابال رہا تھا۔ کچھ گاہک روپے ہاتھ میں تھامے چائے کے منتظر تھے۔

''ارے سنجو! تو یہاں؟'' حمید پکارتا ہوا اس کے قریب گیا۔



سنجو حمید کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ کمہلایا ہوا تھا۔ کچھ دبلا بھی ہو گیا تھا وہ۔ اس نے کن انکھیوں سے اپنے سیٹھ کو دیکھا، پھر حمید کو ایک طرف لے جا کر کہنے لگا کہ اس نے یہاں گاہکوں کو چائے دینے اور کپ گلاس دھونے کا کام اپنا لیا ہے۔ محنت تو بہت ہے پر روز پچاس روپے ملتے ہیں۔ خوب موج کرتا ہوں۔ تو بھی آ جا۔ کیا رکھا ہے پڑھائی وڑھائی میں! نوکری تو ملتی نہیں۔ ابھی کمانے لگیں گے تو پیسہ جمع ہوگا، کسی کے محتاج نہیں رہیں گے۔

''گھر میں پتہ چل گیا تو؟'' حمید نے خدشہ ظاہر کیا۔

سنجو ہنس کر بولا۔ ''نہیں کیسے پتہ چلے گا؟ اور اگر معلوم ہو بھی گیا تو کہہ دیں گے۔ پڑھائی میں ہمارا جی نہیں لگتا۔ پانچ دس روپے سے ہمارا خرچ نہیں چلتا! اتنی سی عمر میں کماتے ہیں، یہ کیا کم ہے!''

''یہ غلط بات ہے۔'' کہنے کو حمید کہہ گیا، پھر اس کے دل میں بھی لڈو پھوٹنے لگے ۔۔۔ پچاس روپے تو بہت ہوتے ہیں!

وہ دونوں غریب گھرانے کے تھے۔

سنجو نے چارہ ڈالا۔ ''کیا سوچ رہا ہے؟ کروں تیرے لیے بات؟ خوب مزے کریں گے۔ فلمیں دیکھیں گے۔ چائے پکوڑی۔ ڈوسے ووسے کھائیں گے۔ خوب تفریح کریں گے۔ بڑا مزہ آئے گا۔ تو آ جائے تو مجھے بھی اچھا لگے گا۔ اکیلے میں اچھا نہیں لگتا یار۔ بول، کروں بات؟''

حمید سنجیدہ ہو گیا۔ ''ابھی نہیں سوچ کر بتاؤں گا۔''

اسے لگ رہا تھا۔ سنجو کا یہ قدم ٹھیک نہیں ہے۔ کبھی نہ کبھی بھانڈا پھوٹے گا۔ پھر بڑی مار پڑے گی۔ سنجو تو اپنی بوڑھی اور لاچار ماں کو چکمہ دے سکتا ہے، وہ کیسے دے گا؟ اس کے ابو اور بھائی جان ۔۔۔ دونوں ہی بڑے سخت ہیں۔ معلوم ہونے پر مار ہی ڈالیں گے۔

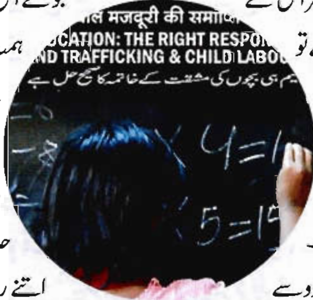
نہیں، نہیں، تعلیم چھوڑ کر وہ یہ کام نہیں کرے گا۔ جب کچھ بڑا ہو جائے گا تب ہی خود کمانے کے بارے میں سوچے گا۔

حمید اِن ہی خیالوں میں گم، چلا تو گیا لیکن اس کے سامنے پچاس روپے کا نوٹ لہرانے لگا۔ پچاس روپے! ۔۔۔ دو دن میں سو روپے! ۔۔۔ چار دن میں دو سو!!! ۔۔۔ وہ گننے لگا۔ پھر ہزار ۔۔۔ دو ہزار ۔۔۔ ارے! اس طرح وہ راجہ بھوج بن جائے گا؟

آخر کار اس سے رہا نہ گیا۔ ایک روز اسکول سے چھٹی لی اور سنجو کے ساتھ کام میں جٹ گیا۔ پہلے دن ہی اس کے ہوش فاختہ ہو گئے۔ تھک کر چور ہو گیا ۔۔۔ چھورے بابے بیگ کو چائے دے کے آ۔ میٹرو بوٹ سے کپ لے کے آ۔ ارے! ایسے کیسے چل رہا ہے؟ ۔۔۔ کوئی مر گیا ہے کیا؟ ۔۔۔ جلدی جلدی ہاتھ چلا ۔۔۔ ہاتھوں میں طاقت نہیں ہے کیا؟ ان کے علاوہ بھدی بھدی گالیاں ۔۔۔ گاہک سنتے اور ہنستے تھے۔

حمید کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''مجھ سے کام نہیں ہوگا سنجو۔ بستہ دے، گھر جاؤں گا۔''

سنجو نے اس کے کاندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ''اتنی جلدی ہمت مت ہار میرے یار! شروع شروع میں ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ بعد میں عادت ہو جاتی ہے۔''



حمید کچھ نہیں بولا۔ چپ چاپ اپنا بستہ لے کر چلا گیا۔ اسے یوں پچھتاوا ہو رہا تھا جیسے کوئی جرم کر ڈالا ہو۔ حالانکہ اس کی جیب میں دس دس کے پانچ نوٹ تھے۔ اتنے روپے اس کے پاس کبھی نہیں ہوئے تھے۔ پھر بھی وہ اداس ہو گیا۔ یہ اچھا رہا کہ اس کی اِس حالت کی گھر میں کسی کو خبر نہ ہوئی۔

ان پچاس روپیوں کو حمید نے جی کھول کر خرچ کیا۔ جب وہ ختم ہو گئے تو اسے پھر ہوک اٹھی کہ کام پر چلا جائے۔ اس نے سوچا، ایک دو دن کام کرے گا، پھر لوٹ آئے گا۔ لیکن سیٹھ نے صاف منع کر دیا۔ ''کام کرنا ہے تو ڈھنگ سے کام کر، ورنہ چلتا بن۔ تیرے جیسے یہاں کئی آتے ہیں۔''

سیٹھ کا رویہ اچھا نہیں تھا۔ حمید اپنی بے عزتی کو پی گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ ایک طرف بے عزتی کے ساتھ پیسے تھے اور سنجو جیسے دوست کا ساتھ تھا۔ دوسری طرف تعلیم کا ہرجہ اور ٹیچروں اور گھر والوں کا ڈر۔ کئی دن وہ اسی اُدھیڑ بن میں رہا کہ جائے یا نہ جائے۔ آخر پیسوں کے لالچ کی جیت ہوئی۔



ننجو اور حمید کے مزے ہوگئے۔ شام کو کام سے چھٹی ملتے ہی وہ تفریح کے لئے نکل پڑتے۔ بڑا مزہ آرہا تھا۔ مگر کتنے دن؟ ایک روز تو بھانڈا پھوٹنا ہی تھا۔

حمید کے ماموں جانے کہاں سے اُدھر نکل آئے۔ حمید کے ہاتھوں سے تین چار گلاسیں چھوٹ کر ٹوٹ گئے تھے اور سیٹھ اس پر بری طرح برس رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے حمید پر ہاتھ بھی اٹھالیا۔ وہ ہاتھ اچانک تھام لیا گیا۔ ”خبردار! جو میرے بچے پر ہاتھ اٹھایا تو! چھوٹے چھوٹے بچوں سے مزدوری کرواتے ہو، شرم نہیں آتی؟ جانتے ہو، بچوں سے کام کروانا قانوناً جرم ہے!“

یہ ماموں تھے۔ حمید کے کان کھینچتے ہوئے بولے۔ ”ابھی ہماری حالت اتنی نہیں گری ہے کہ تمہیں ایسا کام کرنا پڑے۔ کس صحبت میں پڑ گئے ہو تم؟ کون ہی تمہیں بہکانے والا؟“ حمید نے چور نگاہوں سے ننجو کی طرف دیکھا، جو قریب ہی گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔

سیٹھ نے ننجو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم زبردستی کسی کو تھوڑے نا لاتے ہیں! یہ چھوکرا لایا تھا اسے۔“

ماموں نے ننجو کی طرف غصے سے دیکھا، تو وہ فوراً پلٹ کر کپ پلیٹ دھونے بیٹھ گیا۔

ماموں حمید کا ہاتھ پکڑ کر لے جانے لگے، تو وہ بولا ”چلتا ہوں ماموں جان!۔۔۔ بستہ تو لے لوں۔“

وہ تھڑی کے پاس ایک کیبن کی طرف گیا اور اس کے پیچھے چھپا ہوا اپنا بستہ اٹھالایا۔

”تو تم یہاں اسکول سے بھاگ کر آتے ہو؟ اب میں سمجھا۔ تب ہی تمہاری امی کہہ رہی تھیں کہ حمید روز بہ روز کمزور اور دبلا ہوتا جارہا ہے۔ جانے کیا بات ہے؟ آج معلوم ہوا، صاحبزادے کمانے نکلے ہیں۔ گھر تو چلو، تمہاری وہ خبر لی جائے گی کہ نانی یاد آجائے گی۔“

حمید ٹھٹک کر کھڑا ہوا گیا۔ رونی آواز سے بولا۔ ماموں جان! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ پلیز، گھر پر کچھ مت کہیے گا۔

”چلو، کچھ نہیں کہوں گا۔ پہلے وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کروگے۔ تمہیں ابھی معلوم نہیں ہے، ایک ذراسی غلطی سے لوگوں کی زندگیاں تباہ و برباد ہوجاتی ہے۔ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو، تو اپنے ابا سے، مجھ سے، بھائی جان سے کھل کر کہو۔ غلط صحبت میں نہ رہو۔“

حمید کان پکڑتے ہوئے بولا ”وعدہ! پلیز ماموں جان مجھے بچالینا۔“

ماموں جان نے مسکرا کر حمید کے شانے تھپکائے۔ ■

Hasan Jamal, Near Panna Nivas,
Lohar Pura , Jodhpur-342001

■ محمد طاہر صدیقی

چھوٹی سی بھول

راجو سڑک پر جارہے اسکولی بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ روز صبح جب بچے کندھے پر بستہ ٹانگے، ہنستے بولتے اپنے اپنے اسکول کو جاتے ہیں تو راجو کا دل بیٹھ سا جاتا ہے۔ اسے اپنا گھر، ماں باپ بھائی بہن اور اپنا اسکول یاد آتا ہے۔ وہ بھی ایسے ہی بستہ لے کر اسکول جاتا تھا۔ لیکن اب تو یہ سب خواب ہوگیا۔ تبھی ڈھابے کے مالک کی کڑک دار آواز سنائی دی۔ ''اے راجو کہاں چلا گیا، برتن کب دھوئے گا۔'' راجو نے میز پر پڑے جھوٹے برتن اٹھائے اور نل کے نیچے جاکر انھیں دھونے لگا۔ آج کا یہ راجو دو مہینے پہلے راجو نہیں تھا۔ تب تو اس کا نام سوہنا ہوا کرتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ندی کے کنارے گاؤں میں رہتا تھا۔ گھر میں ماں باپ، دادا دادی اور چھوٹی بہن تھی۔ وہ پانچویں درجے میں پڑھتا تھا۔ گاؤں کے بچوں کے ساتھ ہی وہ اسکول جاتا تھا۔ شام کو امرائی میں دوسرے بچوں کے ساتھ ہی چھپنا، کبڈی، گلی ڈنڈا، اور بہت سے کھیل کھیلتا تھا۔ گھر پر بھوری گائے کے بچھڑے کو سہلاتا۔ صبح شام گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹاتا۔ ماں اسے پیار سے سوہنا کہتی اپنے پاس بٹھا کر دودھ روٹی کھلاتی۔ ایک دن اس کی کتاب کھوگئی۔ پڑھائی کے وقت استاد نے کتاب نہ ہونے پر اسے ایک تھپڑ لگا دیا۔ سوہنا کے چھوٹے من کو چوٹ لگی شام کو گھر آکر پتاجی کو بتایا تو وہ بھی ڈانٹنے لگے کہ اپنی چیزیں ٹھیک سے سنبھال کر رکھا کرو۔ بات من میں بیٹھ گئی کہ اب وہ اسکول نہیں پڑھنے جائے گا۔ گھر پر بھی نہیں رہے گا۔ سب اسے ہی ڈانٹتے ہیں۔ ایک پل کو بھی اس کے دماغ میں نہیں آیا کہ یہ لوگ اسے اس کی بھلائی کے لیے ڈانٹتے ہیں اور صرف ڈانٹتے نہیں پیار بھی اتنا ہی کرتے ہیں۔ مگر یہ سب سوچنے کی اس کو عقل ہی کہاں تھی؟ رات کو وہ چپ چاپ اٹھا اور گھر سے بھاگ آیا۔ کیسے کیسے وہ کہاں پہنچا، کس طرح چھپ چھپ کر اس شہر میں آیا اور آخر اس ڈھابے میں برتن دھونے کا کام کرنے لگا۔ ڈھابے والے کی گالیاں و مار پیٹ سہتا رہا۔ گھر لوٹنے کا اس کا بہت من کرتا۔ لیکن شرم کی وجہ سے پاؤں ہی نہیں اٹھتے تھے۔ اس کے ماں باپ اس کے بنا کتنے پریشان ہوں گے۔

کہاں کہاں اسے نہیں کھوجا ہوگا۔ پر وہ گھر کیسے جائے۔ یہاں تو صبح چار بجے سے رات کو گیارہ بجے تک کام ہی کام۔ ڈھابے کا مالک اسے آدھے گھنٹے کے لیے بھی کھیلنے کے لیے نہیں چھوڑتا۔ جب دوسرے لڑکے باہر کھیلتے ہیں تو اس کا من اس کے بس میں نہیں رہتا۔ کہیں ہاتھ سے پیالہ چھوٹ گیا تو بس مالک کے لات گھونسے۔

رات کو سات بجے سے ہی اسے نیند آنے لگتی ہے، پر آرام کہاں؟ نیند میں ہی وہ میز صاف کرتا، پانی بھرتا، جھوٹے برتن اٹھاتا۔ شام کو اسے جلدی کھانا اس لیے نہیں دیتے کہ وہ جلدی سو نہ جائے۔ دس سال کا بچہ۔ کام ختم ہونے تک اسے کچھ ہوش ہی نہیں رہتا۔ کسی کونے میں لڑھک کر سو جاتا۔ کسی کو اس بات کی فکر نہیں کہ اس نے کچھ کھایا یا نہیں۔ صبح چار بجتے ہی مالک پھر لات مار کے جگا دیتا۔ پھر وہی کام۔

اوہ! وہ کیوں گھر چھوڑ کر چلا آیا۔ ماں کا پیارا سوہنا راجو کیوں بن گیا۔ یہ تو اس کے کھیلنے کھانے اور پڑھنے کے دن تھے۔

روز کی طرح آج بھی راجو ٹرے میں گندے گلاس لیے دھونے جا رہا تھا۔ سامنے سڑک پر کچھ بچے گیند کھیل رہے تھے۔ راجو کھیل میں کھو گیا۔ تبھی ڈھابے کے مالک کا بھیانک چہرہ سامنے دکھائی دیا۔ ڈر کے مارے راجو کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ گئی اور چھن سے گلاس ٹوٹ گیا۔ مالک نے ڈنڈا اٹھایا اور راجو کی طرف جھپٹا۔ راجو ایک ہی جھٹکے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

نہیں وہ ایسے شیطانوں کی مار کھانے کے لیے پیدا نہیں ہوا ہے۔

نہیں، اب وہ راجو نہیں رہے گا۔

وہ اپنے گھر جائے گا اسکول میں پڑھے گا۔

بڑا ہو کر اپنی زندگی خود سنوارے گا۔



سوھنا کی آنکھوں میں اس کا گاؤں اور اس کا سپنا تیر رہا تھا

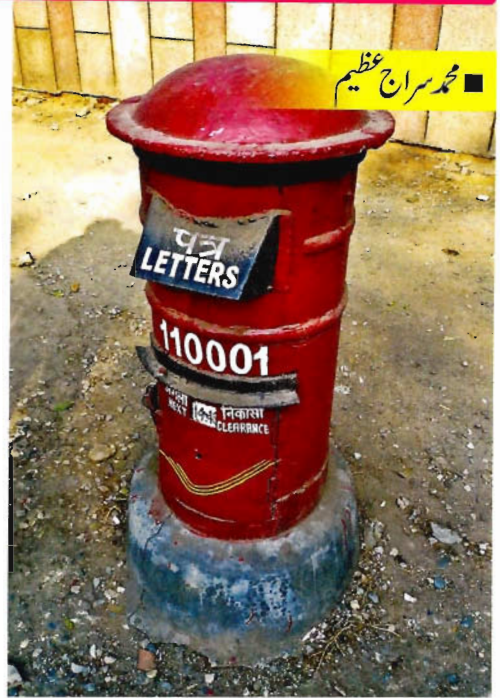
سوہن کمان سے چھوٹے تیر کی طرح سڑک پر پہنچ گیا۔ ڈھابے کا مالک دکان پر کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ سوہنا کے چھوٹے چھوٹے پیر تیزی سے اٹھ رہے تھے اس کی آنکھوں میں اس کا گاؤں اور اس کا سپنا تیر رہا تھا۔

■

Mohd. Tahir Siddiqui
N-139 B-1, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, New Delhi - 110025

ڈاکیہ شبھیندو داس

■ محمد سراج عظیم



جیسے ہی دن کے گیارہ بجتے گلی کے نکڑ سے ایک سائیکل مڑتی اور گھنٹی کی جانی پہچانی آواز سنائی دیتی، محلے کے لوگ سمجھ جاتے کہ ڈاکیہ آ گیا۔ ڈاکیہ خاکی وردی پہنے، سر پر ٹوپی لگائے کندھے پر کینواس کا خاکی بیگ ڈالے کان پر پنسل لگائے، جیبوں میں رجسٹری، منی آرڈر اور ٹیلی گرام رکھے ہوئے آتا۔ وہ گلی کے نکڑ سے مڑ کر اپنی سائیکل سے اتر جاتا اور پیدل چلتا ہوا اس گلی کے لوگوں کو ان کی ڈاک دیتا۔ کسی کا خط، کسی کی رجسٹری، کسی کا منی آرڈر اور کسی کا ٹیلی گرام وہ سب کے خط ان کے دروازے پر ڈالتا جاتا اور 'ڈاک' کی آواز لگاتا جاتا۔ لوگ آتے اپنے خط اٹھاتے جو پڑھے لکھے ہوتے خود پڑھ لیتے اور ان پڑھ ڈاکیے سے اپنے خط پڑھواتے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ اگر اس زمانے میں کسی کا تاریعنی ٹیلی گرام آتا تو لوگ پریشان ہوجاتے۔ ان کے دل دھڑکنے لگتے تھے اور چہروں پر فکر چھا جاتی تھی کہ پتہ نہیں تار میں کیا خبر ہو۔

ڈاکیہ بنگال کے بردوان ضلع کا رہنے والا تھا۔ نام تھا شبھیند و داس۔



وہ بہت نیک اور شریف آدمی تھا۔ محکمہ ڈاک کی نوکری کے سلسلے میں یوپی کے شہر بریلی میں بیس سال سے رہ رہا تھا اور اس درمیان اپنی قلیل آمدنی کی وجہ سے ایک دوبار ہی اپنے گاؤں جاسکا تھا۔ ڈاکیہ شبھیند و داس تھا تو بنگالی لیکن ہندی بھی اچھی بولتا تھا۔ اس نے اپنی کوشش سے اردو پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا تھا جس کی وجہ سے اس کو بہت آسانی ہوگئی تھی۔ جن لوگوں کے اردو میں خط آتے تو ان کو وہ اردو میں پڑھ کر سناتا تھا اور اگر کسی کو جواب لکھوانا ہوتا تو داس بہت اچھی اردو میں خط لکھتا۔ یہ کام وہ بغیر کسی معاوضے کے اور خدمت کے طور پر کرتا۔ سب لوگ اس کی بہت عزت کرتے اور اس سے بہت خوش رہتے تھے۔ سارے محلے والے اس کی شرافت کے قائل تھے۔

داس گلی کے لوگوں کی ڈاک بانٹتا ہوا سیٹھ جی کے گودام کے پاس پہنچتا اور باہر سے ہی سیٹھ جی کو سلام کرتا ''سیٹھ جی سلام'' سیٹھ جی گودام کی کھپریل میں بیٹھے بیٹھے جواب دیتے ''سلام بھیا''

ڈاکیہ شبھیند و داس سیٹھ جی کی بہت عزت کرتا اور ان کا بڑا ادب اور احترام کرتا تھا۔ سیٹھ جی اگر فرصت میں ہوتے تو اس کو گودام میں بلا لیتے۔

''ہاں بھئی داس سب ٹھیک ٹھاک ہے نا'' سیٹھ جی اپنا حقہ گڑ گڑاتے ہوئے پوچھتے۔

''جی مالک سب اوپر والے کی کرپا ہے'' شبھیند و داس ہنس کر جواب دیتا۔ ہنسنے میں اس کے بڑے بڑے دانت چمکنے لگتے۔ سیٹھ جی

داس سے بالکل دوستانہ انداز میں باتیں کرتے۔ سیٹھ جی سے وہ کبھی کبھی بہت دیر تک باتیں کرتا رہتا اپنے گھر اپنے گاؤں، ماں باپ خاندان، بیوی بچوں کی طرح طرح کی باتیں۔ سیٹھ جی بھی اس کی باتیں غور سے سنتے۔ کبھی اس کے ساتھ ہنستے، کبھی اس کو مشورہ دیتے، اگر وہ اپنی غریبی کی بات کرتا تو وہ اس کو دلاسہ دیتے اس کی ہمت بندھاتے زندگی سے ہار نہ ماننے کی صلاح دیتے اور محنت کرنے کی نصیحت کرتے۔ کبھی کبھی اس کی مدد بھی کرتے تھے۔

داس کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے تھی جس میں وہ اپنے دو بچوں اور بیوی کا خرچ پورا کرتا اور ماں باپ کو بھی خرچہ بھیجتا تھا۔ عید آتی تو ڈاکیہ داس عید والے دن سیٹھ جی کے رشتے داروں کے بہت سے عید کارڈ لاتا۔ سیٹھ جی اس کو سوئیاں کھلاتے اور ایک روپیہ عیدی دیتے۔ داس بہت خوش ہوتا سیٹھ جی کو عید کی مبارکباد دیتا۔ یہ وہ سارے محلے والوں کے ساتھ کرتا۔ عید کے دن شھبیند و داس کے پاس عیدی کے اچھے خاصے پیسے ہو جاتے غرض ڈاکیہ شھبیند و داس سیٹھ جی کے ساتھ اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا ان کے پاس تھوڑی دیر بیٹھتا اور چلا جاتا۔



ایک دن شھبیند و معمول کے مطابق آیا وہ بہت اداس سا سب کی ڈاک بانٹ رہا تھا۔ اس کی آواز بھی ہلکی تھی، چہرہ اترا ہوا تھا اور دیکھنے میں بہت فکر مند لگ رہا تھا۔ سیٹھ جی کے گودام کے پاس پہنچ کر اس نے بہت دھیمے لہجے میں سیٹھ جی کو سلام کیا۔ وہ تجربہ کار تھے ان کو سمجھتے دیر نہیں لگی کہ آج کوئی خاص بات ہے۔ سلام کا جواب دیتے ہی انھوں نے پوچھا۔ ''ارے بھئی داس کیا بات ہے آج بہت اداس دکھائی دے رہے ہو خیریت تو ہے'' داس ایک دم ٹھٹھک گیا اس کو جیسے ہمت مل گئی ہو اور وہ سائیکل کھڑی کر کے فوراً گودام میں آ گیا۔

''کیا بتاؤں سیٹھ جی رام جانے آپ میری بات سچ مانیں گے کہ نہیں لیکن میں آپ کو اپنا بڑا ہمدرد سمجھتا ہوں اس لئے آپ سے کہتا ہوں۔ آج بازار میں ایک دوکاندار کا منی آرڈر دینے گیا جیسے ہی میں نے اس کی رقم دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پیسے غائب تھے۔ میں گھبرا گیا۔ ساری بات دوکاندار کو بتائی تو وہ یقین کرنے کو تیار نہیں ہوا۔ وہ مجھے برا بھلا کہنے لگا۔ کہنے لگا تم جھوٹ بول رہے ہو تم نے رقم چوری کر لی ہے۔ تمہاری نیت خراب ہو گئی ہے تم بے ایمان ہو میرے پیسے شام تک دے دو نہیں تو میں تمہاری شکایت پوسٹ ماسٹر صاحب سے کر دوں گا اور تمہاری نوکری چلی جائے گی۔ سیٹھ جی میں اپنے بچوں کی قسم کھاتا ہوں میں نے رقم کہیں چوری نہیں کی، زندگی میں کبھی ایک پیسے کی بے ایمانی نہیں کی، جو میری تنخواہ ہے اس میں ہی بھگوان کا شکر ادا کرتا ہوں۔ مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ پیسے کیا ہوئے، کہیں گر گئے، کسی نے نکال لیے، میری عقل کچھ کام نہیں کر رہی ہے۔ بھگوان جانے کیا ہوگا۔ مجھے لگتا ہے میری نوکری چلی جائے گی۔ سیٹھ جی مجھے پانچ لوگوں کے منی آرڈر کے پیسے دینا ہیں۔ سیٹھ جی بڑی امید کے ساتھ آپ سے ایک وِنتی کر رہا ہوں اگر آپ مجھے ڈیڑھ سو روپے ادھار دے دیں تو میری نوکری بچ جائے گی، اور میرے بچے بھوکے مرنے سے بچ جائیں گے۔ سیٹھ جی میں جیون بھر آپ کے احسان تلے دبا رہوں گا۔ میں دھیرے دھیرے آپ کے پیسے لوٹا دوں گا۔'' یہ کہتے کہتے داس کا گلا رندھ گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

سیٹھ جی خاموشی سے شبھیند و داس کی بات سنتے رہے۔ انھوں نے پوچھا "تم نے اچھی طرح اپنی جیب اور بیگ کو ٹٹولا، تمہیں یاد ہے پیسے کہاں رکھے تھے، تمہارے پوسٹ ماسٹر نے تمہیں پیسے دیے بھی تھے یاد کرو۔"

"ہاں سیٹھ جی پوسٹ ماسٹر صاحب نے مجھے پیسے دیے تھے میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں پیسے گئے کہاں۔ میں اپنی جیبوں میں، بیگ میں سب کی تلاشی کئی کئی بار لے چکا ہوں، راستے میں دیکھتا ہوا دوبارہ پوسٹ آفس واپس گیا لیکن پیسے نہیں ملے۔" یہ کہہ کر داس پھر رونے لگا۔



سیٹھ جی نرم دل آدمی تھے، انھوں نے بھی غریبی کے دن دیکھے تھے وہ داس کی سچائی کو سمجھ گئے تھے۔ انھوں نے اپنی بنڈی کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے روپیوں کی گڈی نکالی اور دس دس کے پندرہ چوڑے نوٹ نکال کر داس کو دے دیے۔ "لو سنبھال کر رکھو" سیٹھ جی نے کہا۔

شبھیند و کا چہرہ خوشی سے کھل کھلا اٹھا۔ روپے لے کر وہ سیٹھ جی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "سیٹھ جی آپ بھگوان کا روپ ہیں بھگوان آپ کو اور ترقی دے آپ نے میرے اوپر میرے پریوار کے اوپر بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

"نہیں داس ہم نے کچھ نہیں کیا اوپر والے نے اس لائق بنایا تو ہم سے جو بھی بن پڑا ہم نے کیا، نہیں تو ہماری کیا بساط تھی۔ لیکن آگے سے پیسے کوڑی کا دھیان رکھنا۔" سیٹھ جی انکساری سے بولے۔

جب اگلے مہینے کی پہلی تاریخ آئی اور داس کو تنخواہ ملی تو وہ سب سے پہلے سیٹھ جی کے پاس آیا اور ان کو بیس روپے دیتے ہوئے بولا "مالک آپ یہ رکھ لیں میں ہر مہینے آپ کو اسی طرح پیسے واپس دیتا رہوں گا۔" انھوں نے پیسے رکھ لیے۔ پہلی تاریخ آئی اور ڈاکیہ داس ان کو بیس روپے واپس کر دیتا۔

آخر میں جب دیوالی آنے والی تھی تب داس نے آخری بار سیٹھ جی کو دس روپے واپس کیے۔ تب سیٹھ جی داس سے بولے رکو اور انھوں نے اپنی بنڈی کی جیب سے ایک سو چالیس روپے نکالے اور شبھیند و داس کو ان میں دس روپے ملا کر ڈیڑھ سو روپے دیے۔ داس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سیٹھ جی بولے "داس یہ روپے تم اپنے پاس رکھو یہ تمہارے ہیں۔ تم واقعی بہت شریف اور ایماندار ہو اگر تم پیسے واپس نہیں کرتے تو ہماری نظر میں تمہاری کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اب تمہارا قرضہ بھی اتر گیا اور تمہاری ایمانداری پر آنچ بھی نہیں آئی۔ تم نے بتایا تھا کہ پچھلے کئی برسوں سے تم اپنے ماں باپ کے ساتھ دیوالی منانے کے لئے بردوان نہیں گئے ہو۔ ان پیسوں سے اس بار کی دیوالی تم اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ منانا۔"

"سیٹھ جی آپ تو بہت مہان ہیں۔ مجھے آپ نے کرتگیہ کر دیا۔ بھگوان بہت کم ایسے لوگوں کو جنم دیتا ہے میں آپ کے چرن اسپرش کرتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا داس سیٹھ جی کے قدموں پر جھک گیا۔

سیٹھ جی نے فوراً اس کو اٹھاتے ہوئے کہا "ارے ارے داس یہ تم کیا کر رہے ہو، ہمیں کیوں گنہگار کر رہے ہو۔"

■

Mohd. Siraj Azeem
A-47, Zakir Bagh, Okhla Road, Jamia Nagar, New Delhi-110025

چندا ماما اور چرخے والی بُڑھیا

احمد ذاکر قاسمی

بہت دنوں کی بات ہے۔ ہمارے تمھارے پیارے چندا ماما آسمان میں نہیں زمین پر رہتے تھے۔ زمین کے باشندوں کے ساتھ! پیارے پیارے چندا ماما سب لوگوں کے ماما تھے اور بچوں کی آنکھ کے تارے تھے۔ وہ جدھر سے گذرتے دور تک روشنی ہوجاتی۔ جنگل، درخت، جھاڑیاں، میدان، کھیت، تالاب، ندی، نالا، گھر، راستہ اور پگڈنڈی سب ان کی روشنی سے چمک جاتے اور ساری دِشائیں من موہک ہوجاتیں۔ ان کی صاف، شفاف دھلی ہوئی چاندنی میں لوگ گھر سے باہر نکل آتے اور انھیں پیار سے دیکھنے لگتے۔ راستے کی دھول چمک جاتی۔ وہ جس گاؤں سے گذرتے وہاں کے لوگوں سے ملا کرتے۔ چندا ماما بہت رحم دل تھے۔ ہر ایک سے محبت کرتے تھے۔شاید اسی لیے وہ دیکھنے میں بہت خوبصورت لگتے اوران کی اجلی بیشانی ہمیشہ چمکتی رہتی۔ وہ سب کو گلے سے لگاتے اور آگے بڑھ جاتے۔کبھی کبھی وہ پانی کی سطح پراتر آتے۔جھلملاتے پانی میں اپنا سہانا عکس ڈال دیتے اور پانی کی لہروں پر تیرنے لگتے۔رات کے اندھیرے میں چندا ماما دور جانے والے اڑتے پرندوں کو اپنی روشنی میں ان کے ٹھکانے تک پہنچا دیتے ان سے باتیں کرتے اور پرندے آسمان میں اڑتے ہوئے خوشی سے کلکاریاں بھرنے لگتے۔ جس راستے سے پرندے گذرتے وہاں ایک مدھر سی آواز فضا میں بکھر جاتی، اور ہوا میں رک رک کر ہلکی ہلکی گھنٹی سی بجنے لگتی۔ جب کبھی وہ جنگل کی طرف چلے جاتے تو جنگل کے سبھی پیڑ، پودے چمک اٹھتے۔

ایک دن کا ذکر ہے، چندا ماما گھومتے پھرتے ایک گاؤں میں پہنچے۔ وہاں ایک بوڑھی عورت چرخہ چلا کر سوت کات رہی تھی۔اس کا سوت بہت باریک اور مہین ہوتا تھا۔ اس کے کاتے ہوئے سوت سے بہت باریک ململ کی ساری بنتی ، جس کے بارے میں بہت مشہور تھا کہ ململ کی ساری کا ایک پورا تھان ایک انگوٹھی کی گولائی سے آسانی سے پار ہوجاتا ہے۔ جب چندا ماما اس کے گھر کے پاس سے گذرے تو بڑھیا سوت کاتنے میں ایسی کھوئی تھی کہ چندا ماما کے آنے کی اس کو خبر تک نہ ہوئی۔ جب چندا ماما اس کے بالکل قریب آکے کھڑے ہوگئے تو بڑھیا ان کو دیکھ کے کھڑی ہوگئی۔ مگر بہت شرمندہ اور لجائی سی ، اپنے پھٹے لباس کو پکڑ کر چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چندا ماما بڑھیا کا یہ حال دیکھ کر بہت دکھی ہوئے۔انھیں دنیا والوں پر بڑا غصہ آیا۔ وہ غصے سے آگ بگولا ہوگئے اور بولے جو عورت دنیا کو اتنا اچھا کپڑا پہننے کو دیتی ہے وہ خود کتنی غریب ہے اور پھٹی ساری پہنتی ہے۔لوگوں کا دنیا والوں کا کیا یہی دستور ہے؟ کیا یہی انصاف ہے ؟ آگے بڑھ کر چندا ماما نے بڑھیا کو اپنی چھاتی سے لگا لیا، اور آسمان کی طرف اڑنے لگے۔اڑتے گئے، اڑتے گئے اور جہاں تک جاسکتے تھے چلتے گئے۔ یہاں تک کہ آسمان میں ان کی روشنی کا چمکتا ہوا صرف گول عکس باقی رہ گیا۔وہ دنیا والوں سے اتنے ناراض اور خفا تھے کہ پھر دنیا میں لوٹ کے نہیں آئے۔ آج بھی آسمان میں ان کا سفر جاری ہے۔ مگر وہ تھکتے نہیں۔ ہماری تمھاری نانی جیسی وہ بوڑھی عورت آج بھی چندا ماما کے سینے سے لگی چرخہ چلاتی دکھائی دیتی ہے اور اس کے پھٹے کپڑوں کے داغ چاند میں نظر آیا کرتے ہیں۔ ■



Ahmed Zakir Qasmi ,Sayyad Cottage,Lepo Road, NearSuleman Colony,Hazari Bagh, Jharkhand.

■ رضوان رضوی

گیدڑ بھبکی

افریقہ کے ایک گھنے جنگل میں ایک گیدڑ باگڑبلّا اور اس کی بیوی پمپی گیدڑنی رہتے تھے دونوں بہت غریب تھے۔ رہنے کے لئے ان کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ ہر موسم میں وہ اس گھنے جنگل میں سارا دن ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے تھے۔ آخر ایک دن اس بھٹکتی زندگی سے تنگ آکر گیدڑنی نے گیدڑ سے کہا کہ ہم کب تک اس طرح مارے پھرتے رہیں گے ہمارا کوئی گھر تو ہونا چاہئے نا۔ جب ہمارے بچے ہوں گے تو وہ کہاں رہیں گے۔

گیدڑ نے بھی اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ اور پھر دونوں کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں لگ گئے۔ آخر کافی دوڑ دھوپ کے بعد انھیں ایک پہاڑ کے غار میں ایک بہت مناسب جگہ نظر آئی۔ یہ غار کسی شیر کا خالی کیا ہوا تھا۔ دونوں نے جب دیکھا کہ شیر غار خالی کر کے کہیں جا چکا ہے تو انھوں نے اس غار کو اپنا گھر بنالیا اور آرام سے اس میں رہنے لگے۔ غار کے قریب ہی ایک حاسد بندر رہتا تھا۔ اس کو غار میں ان دونوں کا آرام وسکون سے رہنا گوارا نہ ہوا۔ گیدڑ اور گیدڑنی کے دو خوبصورت بچے بھی ہو گئے تھے۔ ایک دن بندر ان کے پاس آیا اور حسد کی آگ میں جلتے ہوئے ان سے کہا۔

''یہ گھر شیر کا ہے۔ تم لوگ اس جگہ کو فوراً خالی کردو ورنہ میں شیر کو جا کر بتادوں گا پھر وہ تم سے پوچھے گا کہ تم کیسے اس کے گھر میں رہتے ہو؟''

یہ سن کر گیدڑنی پریشان ہوگئی کہ اگر سچ مچ بندر نے شیر کو بتادیا اور شیر آگیا تو پھر ہمارا کیا انجام ہوگا۔ وہ اپنے ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر کہاں جائیں گے۔ گیدڑ نے کہا تم پریشان نہ ہو۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ تو بچو! بندر سے ان کا آرام اور سکون دیکھا نہ گیا اور وہ شیر کے پاس جا کر بولا:

''عالم پناہ! پورے جنگل پر آپ کی حکومت ہے۔ آپ جنگل کے ہر دل عزیز راجا ہیں۔ ہر طرف آپ کا رعب اور دبدبہ ہے۔ مگر یہ کتنے افسوس اور شرمندگی کی بات ہے کہ آپ کا گھر کسی اور کے قبضے میں ہے۔ اس پر ایک معمولی سے گیدڑ اور گیدڑنی کا قبضہ ہے۔ اگر آپ نے اس پر فوراً توجہ نہیں دی تو جنگل کے تمام جانوروں پر آپ کا رعب اور دبدبہ ختم ہوجائے گا۔ جلدی جا کر اپنے گھر کی خبر لیں۔''

یہ سنتے ہی شیر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

شیر کے دھاڑنے کی آواز دور سے آرہی تھی۔ گیدڑنی آواز سن کر گھبرا گئی۔

''بالکل پریشان نہ ہو۔'' گیدڑ نے گیدڑنی سے کہا ''جیسا میں نے تم سے کہا ہے ویسا ہی کرنا۔''

جیسے ہی شیر غار کے قریب آیا گیدڑنی نے اپنے دونوں بچوں کو زور زور سے رونے کو کہا۔ بچے رونے لگے تو گیدڑ چلّا کر بولا۔ ''او پمپی؟''

''ہاں باگڑبلّے'' پمپی گیدڑنی نے کہا۔

''پم پم اور پوچی کیوں رو رہے ہیں؟'' بچوں کے نام لے کر

گیدڑ نے پوچھا۔

''شیر کا کلیجہ کھانے کے لئے رو رہے ہیں۔'' پمپی گیدڑنی نے بتایا۔

''ابھی کل ہی تو شیر کا کلیجہ لاکر دیا تھا وہ کھلا دو۔'' گیدڑ نے کہا۔

''وہ باسی ہوگیا ہے۔'' گیدڑنی نے کہا ''شیر کا تازہ کلیجہ مانگتے ہیں۔''



ہے تو انھوں نے پہلے کی طرح بچوں کو رلا دیا۔ بچوں کے رونے کی آواز سن کر پھر گیدڑ نے چلا کر گیدڑنی کو پکارا۔ ''او پمپی!''

''ہاں باگڑ بلّے'' پمپی گیدڑنی نے کہا۔

''ہم پم اور پوچی کیوں رو رہے ہیں؟'' گیدڑ نے پوچھا۔

''بہت بھوکے ہیں'' گیدڑنی نے بتایا۔ ''شیر کا کلیجہ مانگتے ہیں۔''

''ابھی انھیں کسی طرح چپ کراؤ۔'' گیدڑ نے کہا ''میں نے بندر کو بھیجا ہے وہ کسی طرح شیر کو بے وقوف بنا کر لاتا ہی ہوگا۔ اس کا کلیجہ نکال کر دوں گا۔ تھوڑا صبر کرو۔ بس وہ آتا ہی ہوگا۔''

حاسد بندر کو گیدڑوں کا مزے کرنا گوارا نہ ہوا اور شیر سے شکایت کرنے چل دیا

اتنا سنتے ہی شیر کے اوسان خطا ہوگئے۔ اس نے سوچا خدا جانے یہ کون سے جانور میرے گھر میں گھس آئے ہیں جن کے بچے شیر کا کلیجہ کھاتے ہیں۔ وہ ان سے کچھ کہے بغیر واپس دم دبا کر بھاگ گیا۔ یہ دیکھ کر بندر کو بڑا غصہ آیا۔ شیر کے ڈر کر بھاگنے پر وہ پھر شیر کے پاس گیا اور اسے شرم دلاتے ہوئے بولا ''واہ! آپ کیسے جنگل کے راجا ہیں جو کمزور گیدڑ سے ڈر کر بغیر کچھ کہے بھاگ آئے۔''

''نہیں وہ گیدڑ نہیں۔'' شیر نے کہا ''وہ تو کوئی خوفناک درندہ معلوم ہوتا ہے۔''

''عالم پناہ! آپ پھر چل کر دیکھیں۔ وہ گیدڑ اور گیدڑنی ہیں۔'' بندر نے کہا۔ ''آپ ابھی چل کر نکالیں انھیں اپنے گھر سے۔''



شیر کو بندر کی باتوں پر یقین نہیں آیا اس لئے وہ بندر سے بولا ''ایسا کرو تم بھی میرے ساتھ چلو اور اپنی دم میری دم سے باندھ لو۔''

اب گیدڑ اور گیدڑنی نے جو دیکھا کہ بندر اب خود شیر کو لے کر آیا

اب تو یہ سنتے ہی شیر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور لگا بندر کی پٹائی کرنے۔ بندر جان بچا کر بھاگنے لگا۔ مگر اس کی دم تو بندھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی بندر نے زور لگایا اس کی دم ٹوٹ گئی۔

گیدڑ نے اپنی حاضر دماغی سے کام لے کر آنے والی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کی۔ اور ویسے بھی آپ نے گیدڑ بھبکی والا محاورہ تو سنا ہی ہوگا۔ وہ ایسے ہی مشہور نہیں ہے۔ گیدڑ اسی طرح اپنا کام نکالتا ہے۔

■

Rizwan Rizvi ,Ashiyana,Banaulia,
Bihar Sharif, Nalanda. Bihar- 803101



■ مترجم: محمد حسین

نیک دل درزی

ایران کے ایک گاؤں میں ایک درزی رہتا تھا۔اس کا نام رحمت تھا۔وہ بڑا نیک دل تھا،اوراپنا کام محنت اور ایمانداری سے کرتا تھا۔ دن بھر کی کمائی سے جو بھی روکھا سوکھا اسے کھانے کوملتا تھا کھالیتا تھااورخوش رہتا تھا۔

رحمت درزی کا نام دور دراز کے گاؤں تک میں مشہور تھا۔لوگ دور دور سے اپنے کپڑے سلوانے اس کے پاس آتے تھے۔اس طرح اس کے دن اچھے گزر رہے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اسے کام ملنا کم ہوگیا تو کمائی نہ ہونے کی وجہ سے اسے اکثر بھوکے پیٹ ہی سونا پڑتا تھا۔

پھر بھی رحمت خوش رہتا تھا لیکن اس کی بیوی حمیدہ اسے کم کمائی کے دن رات طعنے دیتی رہتی تھی۔ یوں حمیدہ دل کی بری نہ تھی مگر حالات کی تنگی نے اس کے مزاج کو چڑ چڑا بنادیا تھا۔

ایک روز کام کرتے کرتے کافی دیر ہوگئی۔ رحمت نے ایک پوشاک تیار کرنے کے لئے کپڑا کاٹا تھا۔رات ہوجانے کی وجہ سے اس نے سوچا کہ وہ صبح جلدی اٹھ کرسلائی کا کام شروع کردے گا اوروقت پر پوشاک تیار کرلے گا۔

صبح جب رحمت سوکر اٹھا تو اس نے دیکھا کہ اس نے جو پوشاک کاٹ کرر کھی تھی وہ سلی سلائی تیار رکھی تھی۔اسے بڑی حیرانی ہوئی۔

اس نے قریب جا کر دیکھا تو وہ پوشاک اسے سوئی کی باریک دھاگوں سے سلی ہوئی نظر آئی۔رحمت سوچ میں پڑ گیا کہ کسی نے اتنی شاندار پوشاک سی کرر کھ دی ہے۔

جب مالک پوشاک لینے آیا تو وہ اپنی پوشاک کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔اس نے طے شدہ سلائی سے کچھ زیادہ رقم اسے ادا کردی۔اب تو جب بھی رحمت رات کو پوشاک کاٹ کر رکھتا صبح اس کو وہ پوشاک سلی سلائی تیار ملتی۔اب اس کی اچھی آمدنی بھی ہونے لگی اور جلدی ہی وہ ایک مالدار آدمی بن گیا۔

اب حمیدہ کے مزاج میں بھی تبدیلی آ گئی تھی لیکن اتنی دولت ہو جانے کے باوجود انھیں کوئی غرور نہیں تھا۔ وہ دونوں ضرورت مند لوگوں کی دل کھول کر مدد کیا کرتے تھے لیکن ان کے دل میں یہ جاننے کی خواہش رہتی تھی کہ آخر وہ کون ہے جو اس طرح چھپ کر ان کی مدد کرتا رہتا ہے۔

ایک رات جب رحمت نے ایک پوشاک کاٹ کر رکھی تو پتا لگانے کی غرض سے دونوں وہیں ایک پردے کے پیچھے چھپ کر کھڑے ہو گئے۔

آدھی رات گزرنے کے بعد کمرے میں کچھ آہٹ سی سنائی دی۔ رحمت اور حمیدہ ہوشیار ہو گئے، تبھی انھوں نے دیکھا کہ وہاں نہ جانے کہاں سے تین بونے آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی باریک سوئیاں تھیں۔ آتے ہی انھوں نے وہاں رکھے کپڑوں کی سلائی شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر میں پوشاک تیار کر کے وہ سب نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔

اب رحمت اور حمیدہ جان گئے کہ یہی وہ نیک بندے ہیں جو رات میں چھپ کر ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ ان بونوں کی مہربانی سے وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے انھیں کچھ تحفے تحائف دینے کا ارادہ کیا۔

تمام دن دونوں نے خوب محنت کر کے ان بونوں کے لئے ریشمی کپڑے کی پوشاک اور مخمل کے چھوٹے چھوٹے جوتے تیار کئے اور ان سب تحفوں کو ایک میز پر سجا کر وہ دونوں سونے چلے گئے۔

دوسرے روز جب رحمت نیند سے جاگا تو اس نے دیکھا کہ بونوں کے لئے رکھی گئیں پوشاکیں اور مخمل کے جوتے میز پر نہیں ہیں۔ ان کی جگہ پر صرف کچھ سوئیاں اور ایک خط رکھا ہوا ہے۔

رحمت نے تیزی سے آگے بڑھ کر وہ خط اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ خط میں رحمت کو مخاطب کر کے لکھا تھا ”رحمت! تم ایک بہترین درزی ہی نہیں ہو بلکہ ایک اچھے انسان بھی ہو۔ تمہاری نیک نیتی کی وجہ سے ہی ہم لوگوں نے تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب تمہیں ہمارے بارے میں جانکاری ہو گئی ہے۔ اس لئے ہم اب یہاں آنے سے مجبور ہو گئے ہیں۔ تمہاری مدد کے لئے ہم اپنی سوئیاں چھوڑے جا رہے ہیں۔ میز پر رکھے تحفے ہم نے قبول کر لئے ہیں۔ ان سب کے لئے ہم سب تمہارے شکرگزار ہیں۔“



ایران اپنے خوب صورت قالینوں اور لباسوں کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اوپر آپ قدیم ایران میں شادی کی ایک تقریب کی پینٹنگ دیکھ رہے ہیں جس میں دولہا دلہن اور دوسرے لوگ بے حد عمدہ پوشاکوں میں نظر آ رہے ہیں

خط پڑھ کر رحمت سمجھ گیا کہ وہ نیک بونے اب یہاں کبھی نہیں آئیں گے لیکن جو سوئیاں وہ چھوڑ کر گئے تھے اس کی بدولت نہ صرف رحمت ایک عرصہ تک بہترین درزی کہلاتا رہا بلکہ وہ شاد و آباد بھی رہا۔ ■

Mohd.Husain
Reader, Civil Courts, Behraich, UP-271801

خزانہ کیسے ملا

ملکِ شام (سیریا) کی لوک کہانی

کارٹونسٹ: سید واجد علی شاہ

بہت دن ہوئے دمشق میں ایک شخص رہا کرتا تھا، اس کا نام زین العرب تھا۔ وہ بہت غریب تھا۔ اسے اپنے خاندان کو پالنے کے لیے سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ اس نے اپنی محنت کی کمائی سے کچھ رقم بچانا شروع کر دیا۔ جب اس کے پاس کچھ دینار جمع ہوگئے تو اسے فکر ہوئی۔



آخر اس نے اپنے دینار کسی پیڑ کی کھوہ میں چھپانے کا ارادہ کیا

اس نے بڑی ہوشیاری سے رقم پیڑ کے اندر چھپادی



اس نے پیڑ کو اچھی طرح یاد کرلیا...

رقم کو اچھی طرح محفوظ کرنے کے بعد وہ سکون اور اطمینان سے رہنے لگا۔ اب وہ خوش و خرم تھا۔ لیکن یہ خوشی زیادہ دن نہیں رہی۔ رفتہ رفتہ اسے اپنی رقم یاد آنے لگی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اسے خیال آیا...



رات ہوتے ہی وہ چل پڑا

وہ بار بار پیچھے دیکھتا جاتا تھا کہ کہیں کوئی پیچھا تو نہیں کر رہا؟



لیکن اس کی ساری رقم غائب تھی...



وہ بہت پریشان تھا اسے اپنی دنیا ویران نظر آنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اپنا دکھ کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتا تھا۔ آخر اس نے سوچا اس سلسلے میں شہر کے سب سے عقل مند شخص سے بات کی جائے جو اُس کا دوست بھی تھا...







قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب 'ایشیا اور یوروپ کی کہانیاں' مرتبہ محمد قاسم صدیقی سے ماخوذ

نیکی کا انعام

ڈنمارک کی لوک کہانی

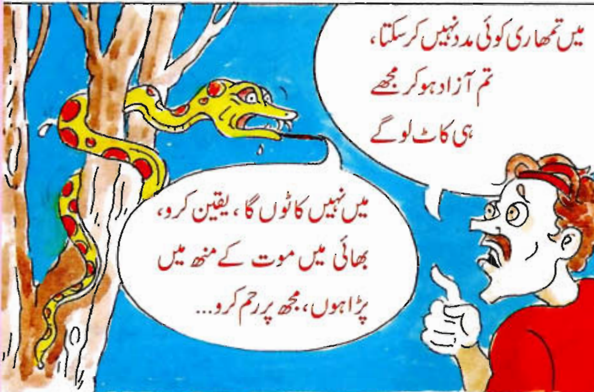
کارٹونسٹ: سید واجد علی شاہ



کسان نے گھبرا کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی...



اچانک اس کی نظر ایک سانپ پر پڑی...



اس طرح سانپ نے کسان کو یقین دلایا اور وعدہ کیا

کسان کو رحم آ گیا۔ اس نے سانپ کے وعدے کو سچ سمجھا۔ فوراً تنے کی دراڑ میں کلہاڑی پھنسائی اور دراڑ کو کھول دیا۔ سانپ آسانی سے باہر نکل آیا

آزاد ہوتے ہی سانپ فوراً کسان کے پاؤں سے لپٹ گیا



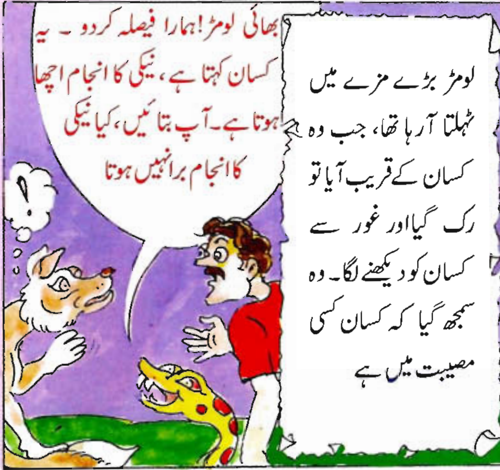



مجھے معلوم ہے دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟
چلو کسی تیسرے شخص سے فیصلہ کراتے ہیں نہ میری بات رہے گی نہ تمھاری
ٹھیک ہے میں اس کے لیے تیار ہوں
وہ پیر میں اچھی طرح لپٹ گیا


کسان کو یقین تھا کہ اس نے نیکی سے کام لیا ہے جیت اسی کی ہوگی۔ وہ جنگل میں تیسرے شخص کی تلاش میں نکلا۔ راستے میں اسے ایک بوڑھا کمزور گھوڑا ملا جو ٹانگ سے لنگڑا تھا۔ اس کی ایک ہی آنکھ بچی تھی اور منہ ایک بھی دانت نہیں تھا، مشکل سے گھاس کھانے کی کوشش کر رہا تھا
چلو اسی سے پوچھ لیتے ہیں
ہاں! اسی سے پوچھتے ہیں

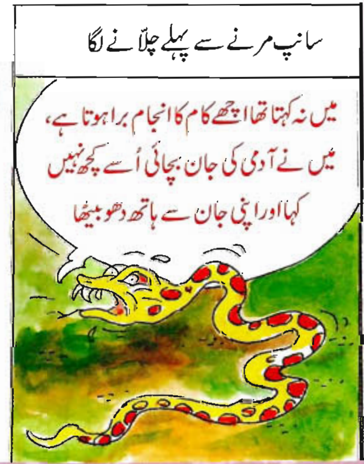

گھوڑا بھائی! اس دنیا میں نیکی کا بدلہ اچھا ملتا ہے یا برا؟
بے شک نیکی کا انجام برا ہوتا ہے
میں نے اپنے مالک کی بیس سال تک خوب خدمت کی اب بوڑھا ہو گیا ہوں تو اس نے مجھے گھر سے نکال کر چکی میں جوت دیا
مجھے کچھ کھانے کو نہیں دیا جاتا بلکہ کھانے کے وقت کھول دیا جاتا ہوں، بس یہ میری خوراک ہے اس لیے کہتا ہوں نیکی کا انجام برا ہوتا ہے


سن لی گھوڑے کی بات؟ اب تو مجھے اجازت ہے کہ تمھیں ڈس لوں
ٹھہرو! سامنے لومڑ آ رہا ہے، اس کی رائے اور لے لیں
کسان نے سانپ کی خوشامد کی


لومڑ بڑے مزے میں ٹہلتا آ رہا تھا، جب وہ کسان کے قریب آیا تو رک گیا اور غور سے کسان کو دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ کسان کسی مصیبت میں ہے
بھائی لومڑ! ہمارا فیصلہ کر دو ۔ یہ کسان کہتا ہے، نیکی کا انجام اچھا ہوتا ہے۔ آپ بتائیں، کیا نیکی کا انجام برا نہیں ہوتا
!?


کسان نے آہستہ سے کہا
ٹھیک ہی کہنا۔ میں تمھیں دو بطخ دوں گا
!
بطخ کی بات پر لومڑ کے منہ میں پانی آ گیا


اس کے ساتھ اسے کسان پر بھی رحم آ گیا
اچھے کاموں کا اچھا ہی انجام ہوتا ہے
!
یہ کہہ کر اس نے سانپ پر حملہ کر دیا اور گردن توڑ دی


سانپ مرنے سے پہلے چلّانے لگا
میں نہ کہتا تھا اچھے کام کا انجام برا ہوتا ہے، میں نے آدمی کی جان بچائی اُسے کچھ نہیں کہا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا


سانپ مر چکا تھا اور کسان آزاد تھا
تم میرے ساتھ گھر چلو اور اپنے انعام کی بطخیں لے لو...

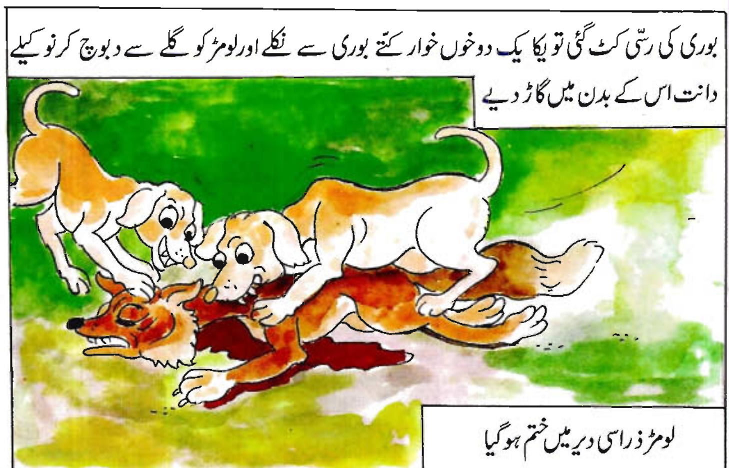

نہیں آپ کا شکریہ! میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ آپ میرے اوپر کتے چھوڑ دیں گے

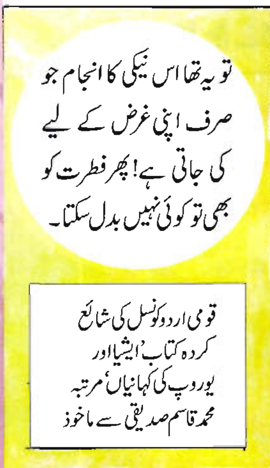

اچھا تو تم یہاں انتظار کرو
میں گھر سے لے کر آتا ہوں
ٹھیک ہے جاؤ


تم جلدی سے دو بطخیں دے دو، میں نے لومڑ سے وعدہ کیا ہے
گھر پہنچ کر کسان نے اپنی بیوی کو پورا قصہ سنا دیا۔ تھوڑی دیر میں بیوی نے ایک بوری لا کر اسے دے دی


بوری بند تھی، کسان خوش خوش لومڑ کے پاس پہنچا
لومڑ بھائی! لو اپنا انعام جس کا وعدہ کیا تھا
شکریہ! میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ نیکی کا بدلہ نیکی ہی ہوتا ہے
لومڑ بوری لے کر اپنے بھٹ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا

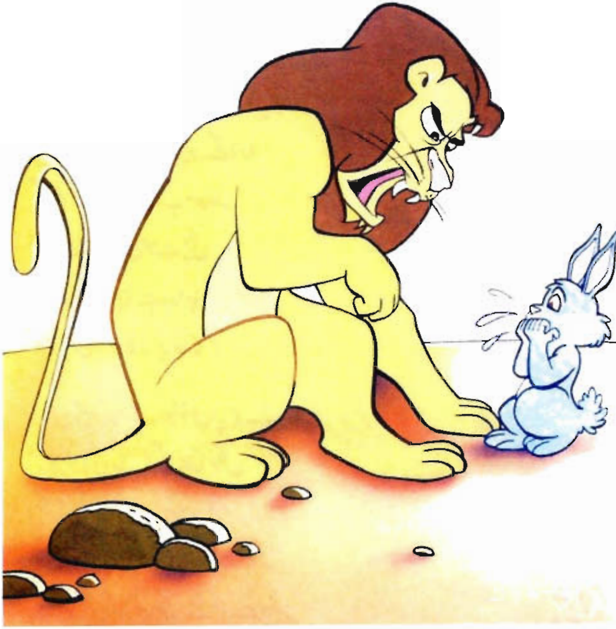

بوجھ بھاری تھا۔ لومڑ تھک گیا، اس نے اپنے گھر پہنچ کر بوری کو کھولنا شروع کیا
اپنے تیز دانتوں سے وہ بوری کی رسی کاٹنے لگا


بوری کی رسّی کٹ گئی تو یکایک دو خوں خوار کتے بوری سے نکلے اور لومڑ کو گلے سے دبوچ کر نوکیلے دانت اس کے بدن میں گاڑ دیے
لومڑ ذرا سی دیر میں ختم ہو گیا


تو یہ تھا اس نیکی کا انجام جو صرف اپنی غرض کے لیے کی جاتی ہے! پھر فطرت کو بھی تو کوئی نہیں بدل سکتا۔
قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب 'ایشیا اور یوروپ کی کہانیاں' مرتبہ محمد قاسم صدیقی سے ماخوذ

■ گلزار

شیر اور خرگوش



بہت ہی بڑے ایک جنگل میں اک بار
بہت ہی بڑا ایک ہی شیر تھا
بہت ہی بڑی اس کی مونچھیں بھی تھیں
بہت ہی بڑی پونچھ اس شیر کی

کبھی پونچھ اوپر اٹھاتا تھا جب
تو پنچھی بھی پیڑوں پہ ڈر جاتے تھے
نکلتا تھا جب غار سے اور غراتا تھا
تو جنگل میں سب ڈر کے چھپ جاتے تھے
بہت سہمے سہمے سے رہتے تھے سب

کبھی کوئی گیدڑ، کبھی لومڑی
کبھی نیل گائے، کبھی کوئی سُور
کبھی ایک دو اور کبھی تین تین
جہاں بھی ملے جس قدر بھی شکار
وہ جنگل کا راجا تھا کھا جاتا تھا

کوئی بھی امن سے نہ جی پاتا تھا
بہت سوچ کر سب کے سب ایک دن
سبھا میں ملے اور کیے فیصلے

''اگر شیر باہر نہ آیا کرے
تو ہر روز پرچی نکالا کریں
کہ ہر روز بس ایک ہی جانور
خود ہی شیر کے غار میں بھیج کر
چین سے جی سکیں!''

''مگر شیر جی سے یہ کیسے کہیں؟''
سبھا کے سبھی سوچ میں پڑ گئے
بہت دیر بعد...
بڑے پیر بکرے جی بولے کہ 'میں'
''میری عمر تو یوں ہی باقی ہے کم
مجھے کھائے جاتا ہے بچوں کا غم

اگر شیر نے کھالیا بھی تو کیا؟''

سنایا بڑے پیر نے جا کے جنگل کا یہ فیصلہ
شیر جی سن کے پہلے تو چونکے ذرا
مگر غور سے سوچا جب معاملہ
تو سمجھے، چلو اپنی محنت بچی
یہ جنگل بھی اپنا ہے، راجا بھی ہم
ہمیں ہی تو ہوگا نہ پرجا کا غم

زباں پھیر کر خشک ہونٹوں پہ بولے
''خبر کر دی جائے گی جنتا کو کل
مگر آج کے دن ...ہلوم- ہلوم...
آج تو آپ ہی میری خوراک ہو۔''
کہا اور بس کھا گیا بوڑھے بکرے کو شیر

دن گزرتے گئے
لوگ گھٹتے گئے مہینے گئے
یوں ہی روز خوراک جاتی رہی شیر کے غار تک
کہ اک دن نکل آئی باری جو خرگوش کی
وہ گھبرا گیا

چلا دھیمے دھیمے سے کچھوے کی چال
پہنچتے پہنچتے اُسے غار تک شام ہونے لگی۔
اُسے دیکھ کر شیر بھنّا گیا—
''چھٹنکی برابر یہ خوراک بھیجی ہے جنگل نے
اور اس قدر دیر سے!
مٹا دوں گا خرگوش کی ذات کو
میں جنگل کا جنگل ہی کھا جاؤں گا!''



سنا اور خرگوش رونے لگا
گڑگڑانے لگا:
''حضور، اِس میں میری نہیں ہے خطا
نہ جنگل سبھا کا کوئی دوش ہے
کہ جنگل نے تو سات خرگوش بھیجے مگر...''
''مگر کیا؟''
''...مگر سر...''
''مگر کیا؟ کیوں ہکلا رہے ہو، بتاؤ مجھے؟''
''م... مگر... مگر سر...!''
''کہاں ہیں تمھارے چھ غدار ساتھی؟''
وہ خرگوش پھر سے سسکنے لگا
''ہمیں راستے میں... حضور، ایک
ظالم نے روکا تھا۔
اور... بہت گالیاں آپ کو دیں،
کہا... میں دوہراؤں کیسے وہ سب کچھ حضور...
کہا، جاؤ کہہ دو... مرے ساتھیوں کو وہی کھا گیا۔''

یہ سننا تھا کہ شیر غرایا، مونچھوں میں بل آ گئے
اکڑنے لگی اُس کی ہنٹر سی پونچھ
اور آنکھوں میں بس خون اترنے لگا:
''کہاں ہے، کدھر ہے، بتا کون ہے؟
مرے ہوتے کس کا ہوا حوصلہ؟
کہ میری رعایا پہ کوئی ظلم کر سکے؟''

''وہ ہے آپ کی ذات کا سر... مگر...
میں...م... میں... میں... وہ کہتا تھا سر...
ج... ج... جنگل کا راجا... اصل
میں... وہ... وہ ہے۔''

لپک کے اٹھا شیر، بولا، ''بتا،
کہاں ہے بتا؟ اس کو کچا چبا جاؤں گا۔''

''وہ پیپل کی پوڑی کے پیچھے
جو کنواں ہے نا
وہیں پہ چھپا ہے وہ کائر، حضور!''

پلک کے جھپکنے میں پہنچے کنویں پہ
خرگوش اور شیر
کھڑے ہو کے کنوئیں پہ اُس شیر نے
جو پانی میں دیکھا تو ہاں — شیر تھا

وہ پانی میں اس کی ہی پرچھائیں تھی
مگر شیر سمجھا وہی دوسرا شیر ہے
دکھائے جو اِس نے بھیانک سے دانت



تو اُس نے بھی دکھلائے ویسے ہی دانت
یہ غرایا، غرائی پرچھائیں بھی
پلٹ کے کنویں سے جو آواز لوٹی

وہ سمجھا — وہ آیا —
یہ کودا — چھپاک سے پانی میں اور
ڈوب کے مر گیا

خوشی سے جو اُچھلا ہے خرگوش تو
ابھی تک اُچھل کر ہی چلتا ہے وہ

قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب 'بوسکی کا پنچ تنتر حصہ اول' از گلزار سے ماخوذ ◘



■ احمد امام بالاپوری

اف یہ گرمی!



گرمی کے دن

رخصت ہوگئے سردی کے دن
آئے ہیں اب گرمی کے دن
سورج پر غصہ ہے طاری
گزرے ہے اک اک پل بھاری
پھیلی ہے ہر سو ویرانی
سوکھ گیا ندیوں کا پانی
لطف نہیں کچھ جینے میں ہے
ڈوبا جسم پسینے میں ہے
پیرو جواں اور بچے بالے
گرمی سے بے کل ہیں سارے

منا راجہ گڈو وانی
مانگ رہے ہیں ٹھنڈا پانی
اکبر خالو، چاچا انور
لائے ہیں بازار سے کولر
چوراہے پر بھائی زلفی
بیچ رہے ہیں شربت قلفی
دن ہو یا ہو رات کا منظر
گھوم رہے ہیں پنکھے فرفر
جاگ رہی ہے خواہش سب کی
پی لیں لیمو شربت، لسّی

■ Ahmed Imam Balapuri, Choori Mahal,
Akola-444302.



جو گرمی نہ ہوتی

یہ گرمی کا موسم ہے کتنا نرالا
کسی پر گراں تو کسی کو ہے پیارا
کبھی غور اس بات پر بھی کیا ہے؟
کہ اس رت نے بچو! تمہیں کیا دیا ہے
دئے گرم موسم نے تربوز پیارے
ہری ککڑیاں اور خربوز سارے
اس کی بدولت ہے رس سنتروں میں
اناس لے کر یہ آیا گھروں میں
اگر گرمیوں کے نہ ایام ہوتے
نہ انگور ہوتے نہ یہ آم ہوتے
مزا کچھ نہ ہوتا جو گرمی نہ ہوتی
یہ شربت نہ ہوتا یہ قلفی نہ ہوتی
حوالے سے اس کے ملی ہیں میاں جی
تمہیں یہ مئی جون کی چھٹیاں بھی

■ محمد غلام رسول اشرف



آگ لگائیں گرمی کے دن





آگ لگائیں گرمی کے دن
سب کو جلائیں گرمی کے دن
چہرے کالے پڑجائیں سب
رنگ اڑائیں گرمی کے دن
گھر میں دن بھر قید رکھیں یہ
کس کو بھائیں گرمی کے دن
سب ہی ہر پل پہلو بدلیں
نیند اڑائیں گرمی کے دن
پنکھا، کولر یا اے سی ہو
سب کو تھکائیں گرمی کے دن
سب ہی ڈھونڈیں ٹھنڈا پانی
حلق سکھائیں گرمی کے دن



کام نہ پورا ہونے پائے
سست بنائیں گرمی کے دن
شربت، قلفی کے ٹھیلوں پر
بھیڑ بڑھائیں گرمی کے دن
اشرف بھی دن رات کہے یہ
اب تو جائیں گرمی کے دن



■ **Mohd Ghulam Rasool Ashraf**, Near Darul Uloom, Nagpur-440018



June 2013

						1 Sa
2 Su	3 M	4 Tu	5 W	6 Th	7 Fr	8 Sa
9 Su	10 M	11 Tu	12 W	13 Th	14 Fr	15 Sa
16 Su	17 M	18 Tu	19 W	20 Th	21 Fr	22 Sa
23 Su	24 M	25 Tu	26 W	27 Th	28 Fr	29 Sa
30 Su						

ثمینہ پروین

جون کا مہینہ
تاریخ کے آئینے میں

دنیا بھر میں دنوں اور مہینوں کی گنتی کے لیے استعمال ہونے والے شمسی کیلنڈر کا چھٹا مہینہ جون June کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں اس کا نام رومنوں Romans کی دیوی جونو Juno کے نام پر جون پڑا تھا، جو اُن کے دیوتا جوپیٹر Jupiter کی بیوی تھی۔ لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ لفظ جون دراصل لاطینی لفظ Juniores جونیورز سے آیا جس کے معنی ہیں چھوٹوں کا یا نوجوانوں کا مہینہ۔ چونکہ 30 دنوں کا یہ مہینہ مئی کے فوراً بعد آتا ہے جس کے دنوں کی تعداد 31 ہے، اور لفظ مئی لاطینی لفظ maiores مایورز یا میجرز سے آیا ہے جس کا مطلب بڑوں یا بزرگوں کا مہینہ ہے، اس لیے 30 دن کے چھوٹے مہینے کا نام جونیئر یا جون ماننے کی بھی کچھ منطق تو اس میں ضرور ہے۔



رومن دیوی، جونو

دور دور تک برف سے ڈھکے ہوئے ملک آئس لینڈ Ice Land کی لوک کہانیوں میں کہا گیا ہے کہ جو شخص 24 جون کی صبح کی اوس میں کوئی بھی کپڑا پہنے بغیر نہالیتا ہے تو بڑھاپا اس سے دور رہتا ہے۔ یوروپ اور امریکہ میں یہ سردی سے نجات دینے والا خوش گوار مہینہ ہے تو ہندوستان اور اس کے پڑوسی ملکوں کے لیے اس مہینے کی سخت گرمی وبال جان سے کم نہیں ہوتی۔ سال کا سب سے بڑا دن بھی اسی مہینے میں پڑتا ہے اور وہ ہے 22 جون۔ لیکن کبھی کبھی یہ 21 جون کو بھی آ جاتا ہے۔

اب آیئے دنیا بھر کے لیے جون کے مہینے کی اہمیت پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ یکم جون، یعنی اس مہینے کی پہلی تاریخ کو براعظم افریقہ کے جنوب میں واقع ملک کینیا کے لوگ اس دن کی یاد مناتے ہیں جب انھیں 1963 میں انگریزوں کی غلامی سے اندرونی طور پر آزادی ملی تھی اور پھر اسی سال 12 دسمبر کو کینیا برطانیہ کی غلامی سے پوری طرح آزاد ہوا۔ 2 جون کو اٹلی والے یوم جمہوریت مناتے ہیں کیوں کہ



اٹلی کے یوم جمہوریہ پر روم میں سرکاری تقریب کا منظر

دوسری عالمی جنگ ختم ہونے کے بعد اسی روز 1946 میں اس بات کے لیے رائے شماری ہوئی تھی کہ اٹلی کے عوام بادشاہی چاہتے ہیں یا عوام کی حکومت جسے جمہوریت کہتے ہیں۔ یہ ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران مسولینی Mussolini وہاں

کا ڈکٹیٹر تھا اور جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر Hitler کا ساتھ دیتے ہوئے مسولینی نے اٹلی والوں پر بڑے ظلم ڈھائے تھے۔اٹلی میں جب رائے شماری ہوئی کہ ملک میں کس طرح کی حکومت ہونی چاہیے تو 1 کروڑ 7لاکھ لوگوں نے بادشاہت کے حق میں ووٹ دیا لیکن 1 کروڑ 27لاکھ لوگ یہ چاہتے تھے کہ جمہوریت قائم ہو اور ملک کے لوگ اپنی حکومت خود چنیں۔بس اسی کی یاد میں اٹلی کا ملک 2 جون کو ہر سال اسی طرح یوم جمہوریہ مناتا ہے جس طرح ہم چھبیس جنوری مناتے ہیں۔

4 جون وہ اہم تاریخ ہے جب 1965 میں اسی روز امریکی



خلا میں چہل قدمی کرتے ہوئے پہلا امریکی خلا باز

خلا باز ایڈورڈ وائٹ Edward White نے اپنے راکٹ سے باہر نکل کر خلا میں چہل قدمی کی۔ یہ کارنامہ انجام دینے والا وہ پہلا امریکی تھا۔ڈیٹرائٹ Detroit امریکہ میں ہنری فورڈ Henry



ہنری فورڈ دنیا کی پہلی تیل سے چلنے والی 'کار' چلاتے ہوئے

Ford نے 1896 میں اسی تاریخ کو گھوڑوں کے بغیر چلنے والی چار پہیوں والی گاڑی سڑکوں پر دوڑا کر سب کو حیران کر دیا تھا۔ یہ گاڑی ایتھینول Ethanol نامی تیل استعمال کرنے والے انجن سے چلتی تھی۔ سات سال بعد 1903 میں ایک سیٹ والی پہلی فورڈ ماڈل کار سڑکوں پر آئی جو دو سلنڈر والے انجن سے چلتی تھی۔ اس کے ڈیزائنر خود ہنری فورڈ تھے جنھوں نے بعد میں کاروں کا ایک بڑا کارخانہ بنایا اور یوں دنیا میں کاروں کا زمانہ شروع ہوا۔

5 جون ہر سال یوم ماحولیات منانے کے لیے مقرر ہے۔ 9 جون 68 وہ تاریخ ہے جب آج سے 1945 سال پہلے روم کا بادشاہ نیرو Nero فوت ہوا تھا۔اس کے نام سے یہ قول بہت مشہور بلکہ بدنام ہے کہ روم جل رہا تھا اور نیرو وائلن بجا رہا تھا Nero fiddled while Rome burned.۔ نیرو کا پورا نام نیرو کلاڈیس سیزر آگسٹس جرمینیکس Nero Claudius Caesar Augustus Germanicus تھا اور تاریخ داں کہتے ہیں کہ اس زمانے میں روم جس بھیانک آگ سے تباہ ہوا تھا وہ نیرو نے خود لگوائی تھی تاکہ خالی ہونے والی زمین پر اپنے لیے محل کھڑے کر سکے۔68 عیسوی میں ایک زبردست بغاوت ہوئی اور اسے تخت سے اتار کر قتل کی سزا سنائی گئی۔مگر اس سے پہلے ہی 9 جون کو اس نے خودکشی کر لی۔



نیرو کا مجسمہ

9 جون کو ہی عظیم انگریزی ادیب چارلس ڈکنس کا 1870 میں انتقال ہوا۔ پک وک پیپرز The Pickwick Papers, اولیور ٹوئسٹ Oliver Twist، ڈیوڈ کاپرفیلڈ David Copperfield اے ٹیل آف ٹو سٹیز A Tale of Two Cities اس کے مشہور ترین ناول ہیں جو پوری دنیا میں پڑھے جاتے ہیں۔

15 جون 1752 کو بنجامن فرینکلن Benjamin


بنجامن فرینکلن گرج چمک کو سمجھنے کے لیے تار سے بندھی پتنگ اڑاتے ہوئے

Franklin نے پہلی بار ثابت کیا کہ بادلوں میں جو گرج چمک ہوتی ہے وہ دراصل بجلی کا کرنٹ ہے۔ دنیا بھر میں ہر ایک سیکنڈ میں 40 سے 50 بار بجلی گرتی ہے جس سے بہت نقصان بھی ہوتا ہے۔ گرج چمک کی مکمل وضاحت کے لیے اب تک ریسرچ ہو رہی ہے۔

15 جون کو ہر سال گاہکوں کا یعنی صارفین کا عالمی دن منایا جاتا ہے اور ہر جون کے تیسرے اتوار کو یوم پدر، یا فادرز ڈے مناتے ہیں جو اس بار 16 جون کو پڑے گا۔ اس مہینے کئی ملکوں کے قومی دن بھی منائے جاتے ہیں جن میں سویڈن 6 جون، پرتگال 10 جون، سیشلز Seychelles 14 جون، آئس لینڈ 17 جون اور کانگو 30 جون کے قومی دن شامل ہیں۔ 28 جون غریبوں کا عالمی دن قرار دیا گیا ہے۔

اب ہندوستان کا حال دیکھتے ہیں۔ 22 جون 1965 کو چھ مہینوں میں آنے والے دوسرے سائیکلون طوفان سے 35000 لوگ ہلاک ہو گئے۔ 9 جون 1964 کو لال بہادری شاستری ہندوستان کے دوسرے وزیراعظم چنے گئے۔ 7 جون 1666 کو شاہجہاں کی بیوی ممتاز محل کا انتقال ہوا جس کی یاد میں تاج محل بنایا گیا۔ جنوبی ہندوستان میں جو مقام آج ترو چراپلی کہلاتا ہے وہاں 9 جون 1752 کو فرانسیسی فوجوں نے انگریزی فوج کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ 17 جون 1858 کو مہارانی لکشمی بائی نے انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ 20 جون 1756 کو بنگال کے نواب سراج الدولہ نے کلکتہ کو انگریزوں کے قبضے سے چھڑا لیا۔ مگر سات ماہ بعد انگریزوں نے پھر قبضہ کر لیا۔ 11 جون 1866 کو انگریز حکومت نے آگرہ ہائی کورٹ قایم کیا جو اَب الہ آباد ہائی کورٹ کہلاتا ہے۔ 12 جون 1897 کو آسام میں زلزلہ آیا جو شاید انسانی تاریخ کا سب سے زوردار زلزلہ تھا جس کے جھٹکے یوروپ کے ملکوں میں بھی محسوس کئے گئے۔ لیکن زلزلے سے تباہی چھوٹے سے علاقے میں ہوئی جس کی وجہ سے صرف 1500 لوگوں کی جانیں اس زلزلے میں گئیں۔ 23 جون 1980 کو محترمہ اندرا گاندھی کے فرزند سنجے گاندھی ہوائی حادثہ میں فوت ہوئے۔ اسی روز ہندوستان کے چوتھے صدر جمہوریہ کا عہدہ سنبھالنے والے قومی رہنما وی وی گری کا بھی انتقال ہوا۔ 26 جون 1975 کو وزیراعظم اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کا اعلان کیا۔

30 جون 1855 کو آج کے جھارکھنڈ میں انگریزوں کے خلاف ایک زبردست بغاوت ہوئی تھی جسے سنتھال بغاوت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سنتھال قبیلے کے ہزاروں لوگ مارے گئے اور 9 مہینوں تک چلنے والی اس بغاوت کو انگریزوں نے بڑی بے رحمی سے کچل دیا۔


لال بہادر شاستری


بیگم ممتاز محل


رانی لکشمی بائی


نواب سراج الدولہ


سنجے گاندھی


محترمہ اندرا گاندھی

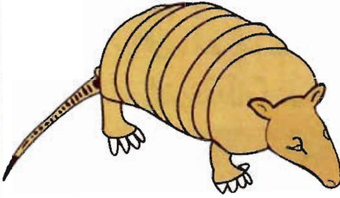
■**Sameena Parveen**, Darassalam, DPS School, Riyadh, SA

■ ایم یوسف انصاری






جانوروں کی چالاکیاں




یوں تو دنیا کا ہر جاندار تھوڑا بہت چالاک اور عقل مند ضرور ہوتا ہے اور انسان اس معاملے میں بلا شبہ سب سے آگے ہے، لیکن کچھ جانوروں کی چالاکیاں دیکھ کر انسان کی عقل بھی حیران رہ جاتی ہے۔ ایسے ہی چند جانوروں کا ذکر آپ اس مضمون میں پڑھیں گے! ادارہ

راقون Raccoon جوڑے کی عقل مندی

راقون جنوبی امریکہ کا بلی نما ایک جانور ہے۔ مگر قد میں بلی سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کی جلد کا رنگ گہرا زرد ہوتا ہے اور آنکھیں کالے دائروں میں ایسے گھری ہوتی ہیں جیسے اس نے عینک لگا رکھی ہو۔ اگر آس پاس پانی بھی ہو تو راقون اپنا کھانا عام طور پر دھو کر کھانا پسند کرتا ہے۔ مچھلی، پرندے، انڈے، سبزی ترکاری اور کیکڑے اس کی خوراک ہیں۔ یہ بڑا چالاک اور عقل مند جانور ہے۔ اس کا ایک قصہ سناتے ہیں۔

ایک کسان نے لکڑی کا ایک بڑا پنجرہ بنوایا۔ اور ایک جوڑا راقون کا خرید کر اس میں ڈال دیا۔ پنجرے میں ساری سہولتیں موجود تھیں۔ کھانے کے لئے چھوٹی میز، نہانے کے لئے حوض، جھولا وغیرہ پنجرے میں تھے۔ دونوں راقون اپنے نئے گھر میں بہت خوش تھے اور خوب اچھلتے کودتے تھے۔ کسان روز وقت پر ان کو دانہ پانی دیتا۔ وہ خوشی خوشی کھا لیتے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ جب وہ کھانا لے کر پہنچا تو مادہ راقون پنجرے کی دیوار سے ٹیک لگائے اداس بیٹھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سارے جہاں کا درد اسی کے جگر میں ہے۔ کسان نے بہت کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کسان اس کا کھانا چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی مادہ راقون کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک چلتا رہا۔ کسان سمجھ گیا کہ اس کے جانے کے بعد مادہ راقون کھانا کھا لیتی ہے۔ اس لئے اس نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ایک دن جب وہ کھانا لے کر پہنچا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ دونوں راقون غائب ہیں۔ اس کی نظر ایک سوراخ پر پڑی۔ اب کسان کا ماتھا ٹھنکا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ دونوں راقون اسے بے وقوف بنا رہے تھے۔ اس کی غیر حاضری میں دونوں راقون پنجرے کی دیوار کو اپنے تیز



دانتوں سے کترتے تھے۔اس سوراخ کو چھپانے کے لئے مادہ راقون وہاں ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی تھی تاکہ کسان کی نظر سوراخ پر نہ پڑے جب سوراخ کافی بڑا ہوگیا تو دونوں نے وہاں سے بھاگ نکلے۔

ریگ مار کی چالاکی

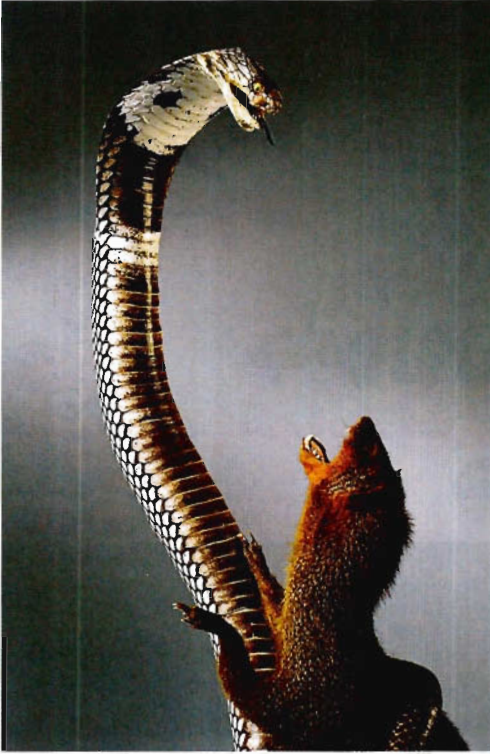
ریگ یعنی ریت اور ماریعنی سانپ۔ یہ ایک قسم کا ریگستانی سانپ ہے۔ جو ریت کے اندر چلتا ہے اور بڑا ہی کائیاں سانپ ہے۔ جب اسے بھوک لگتی ہے۔تو ریت کے باہر اپنا سر تقریباً ایک فٹ نکالتا ہے اور سر کو بالکل ساکت رکھتا ہے اور سارا جسم ریت میں چھپا رہتا ہے۔ دور سے دیکھنے پر وہ کوئی ریگستانی خشک پودا نظر آتا ہے جب کوئی بھولا



بھٹکا پرندہ اس طرف آنکلتا ہے تو اسے ٹھنٹھ سمجھ کر اس پر بیٹھ جاتا ہے۔ سانپ اس کو دبوچ کر کھا جاتا ہے اور پھر ریت کے اندر چلا جاتا ہے۔

نیولے کی چالاکی

نیولا سانپوں کا جانی دشمن ہے اور سانپوں کو مارنے میں ماہر مانا جاتا ہے۔عام طور پر نیولا چوہے اور گھوس کا شکار کرتا ہے۔سانپ اس کی غذا نہیں۔مگر چھوٹے چھوٹے سانپوں کو ضرور کھاتا ہے۔مگر جب پھن دار اور زہریلے سانپوں سے واسطہ پڑتا ہے تو مقابلے پر ڈٹ جاتا ہے۔ ایک بڑی عجیب عادت ہے یہ کیچڑ میں لت پت ہوجاتا ہے پھر دھوپ میں اپنے جسم کو سکھاتا ہے اس لئے کیچڑ اس کے لئے زرہ بکتر کا کام کرتی ہے اس کے بعد یہ سانپ پر حملہ آور ہوتا ہے۔ نیولے کی اس چالاکی کی وجہ سے سانپ اسے ڈسنے کی کوشش ضرور کرتا ہے مگر زہر اثر نہیں کرتا۔



جب سانپ اس پر حملہ کرتا ہے تو نیولا پھرتی سے پھن کے نیچے آجاتا ہے۔قبل اس کے کہ سانپ ڈس لے۔ نیولا اچک کر اس کا نچلا حصہ پکڑ لیتا ہے اور سانپ سے لپٹ جاتا ہے اور اسے مسلسل کاٹتا رہتا ہے۔سانپ لڑلڑ کر تھک جاتا ہے۔تب نیولا اس کے گلے کو تیز دانتوں سے کترنا شروع کر دیتا ہے۔لڑائی کے وقت نیولے کے لمبے اور کانٹوں کی طرح سخت بال کھڑے ہوجاتے ہیں۔جس کی وجہ سے سانپ اسے ڈس نہیں پاتا۔ نیولا جب تک سانپ کو ہلاک نہیں کر لیتا چین سے نہیں بیٹھتا۔زندگی اور موت کی اس جنگ میں نیولے کی ہی جیت ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ خود بھی زخمی ہوجاتا ہے۔ یہ جنگ مسلسل نہیں ہوتی بلکہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہوتی ہے اور کبھی کبھی ایک گھنٹے تک جاری رہتی ہے۔ نیولے کے جسم پر سانپ کے زہر کا اثر ضرور ہوتا ہے مگر اس زہر کو برداشت کرنے کی زبردست قوت بھی اس میں ہوتی ہے۔

لومڑی کی عیاری

لومڑی کی عیاری مشہور ہے۔ وہ جنگل میں پشت کے بل لیٹ جاتی ہے اور مردہ بن جاتی ہے۔ چھوٹے جانور خرگوش وغیرہ اس کا



تماشہ دیکھنے کے لئے قریب آتے ہیں تو مکار لومڑی موٹے تازے شکار کو تاڑ کر پکڑ لیتی ہے اور اس طرح مکاری سے اپنا شکار کرتی ہے۔

گلدار کی ہوشیاری

چیتے کے خاندان کے جانور گل دار کے بدن پر پھول جیسے دھبے ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کا نام گل دار ہے۔ گل یعنی پھول۔ گل دار یعنی پھول والا۔ یہ درختوں پر بسیرا کرتا ہے۔ جب کوئی جانور یا ہرن وغیرہ درخت کے نیچے سے گزرتے ہیں تو ان پر چھلانگ لگا کر دبوچ



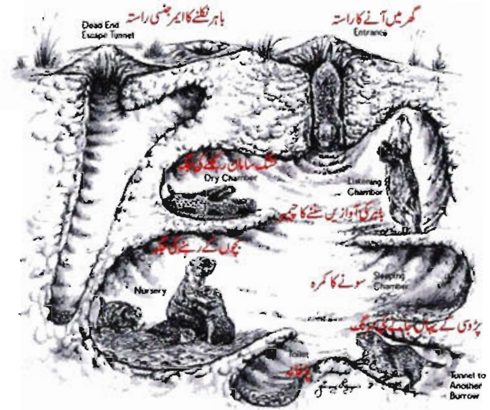
لیتا ہے۔ اس کے شکار کو اکثر شیر چھین لیتا ہے تو گلدار اپنے شکار کو کھینچ کر درخت کی اونچی شاخ پر لٹکا کر مزے سے کھاتا رہتا ہے۔ اب شیر بے بس ہو جاتا ہے کیونکہ وہ درخت پر چڑھ نہیں سکتا۔

میدانی گلہری کی سمجھ داری

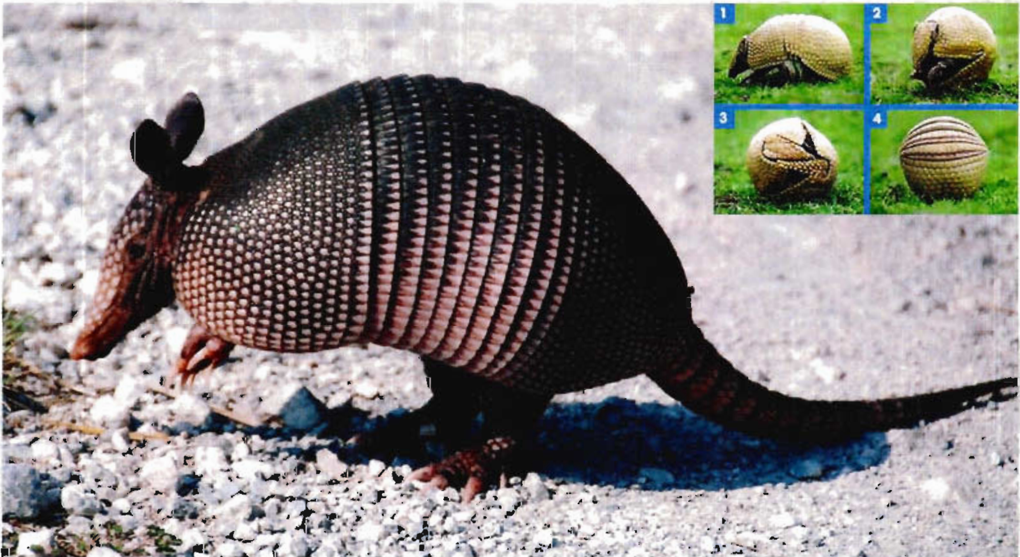
میدانی گلہری Prairie Dog کا تعلق گلہری خاندان سے ہے۔ حالانکہ کسی بھی زاویے سے یہ گلہری نظر نہیں آتی۔ اس کی دم بہت چھوٹی اور چپٹی ہوتی ہے۔ گلہری کی لمبائی ایک ڈیڑھ فٹ ہوتی ہے اور اس کی شکل صورت اود بلاؤ سے کافی ملتی جلتی ہے اس کو انگریزی میں پر یری ڈوگ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ کتے جیسی آوازیں نکالتی ہے۔ یہ سبزی خور جانور ہے۔ اور عام طور پر یہ سبز و شاداب گھاس کھاتی ہے۔ امریکہ کے صوبے ٹیکساس کے علاوہ یہ کناڈا سے لے کر مسکسیکو تک بڑی تعداد میں پائی جاتی ہے۔ یہ گھاس کے میدانوں میں اپنا



مسکن بناتی ہے اس کا بھٹ دیکھنے میں تو معمولی سا مٹی کا تودا نظر آتا ہے۔ مگر ذرا اندر سے اس کا جائزہ تو لیجئے۔ پھر اس کی کاریگری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہ ایک ماہر انجینئر ہے۔ زمین کھود کر چودہ یا پندرہ فٹ لمبی سرنگ تک اپنی پناہ گاہ بناتی ہے۔ سرنگ نما بھٹ میں کئی کمرے ہوتے ہیں۔ ایک سونے اور آرام کرنے کے لئے، ایک چھپنے کے لئے، ایک مہمان خانہ، گھاس کا ذخیرہ رکھنے کے لئے علیحدہ کمرے ہوتے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ خطرے کے وقت باہر نکلنے کا راستہ ایمرجنسی ایگزٹ Emergency Exit ضرور بناتی ہے۔ کبھی کالے پیروں والا جانور فے ریٹ حملہ کرتا ہے تو آواز نکال کر نر گلہری



خبردار کردیتا ہے ۔ فے ریٹFerret کا بدن بڑا ہی لچکیلا ہوتا ہے۔ یہ کبھی تان کر اپنے بدن کو لمبا کرلیتا ہے اور بھٹ میں گھس جاتا ہے۔



سانپ اس کے بچوں کا جانی دشمن ہے۔اپنے خاندان کی حفاظت کرنے کے لئے یہ اپنی جان تک قربان کردیتا ہے۔جب کوئی سانپ گھر میں گھستا ہے تو نرگلہری فوراً دوسرے دروازے ایمرجنسی ایگزٹ سے بیوی بچوں کو نکال کر باہر کرتا ہے اور دروازے کا منہ پتھر سے بند کردیتا ہے۔پھر پلٹ کر داخلی دروازے کی طرف آتا ہے اور اسے بھی بند کردیتا ہے ۔ بے چارہ سانپ اندر قید ہوجاتا ہے۔ بھٹ چھوٹ گیا تو کیا، جان تو بچ گئی۔

ارماڈیلوArmadillo کی ہوشیاری

یہ جانور جنوبی امریکہ کے بعض علاقوں میں پایا جاتا ہے۔اس کی شکل چوہے جیسی ہوتی ہے اور یہ تقریباً 3 فٹ لمبا بہت ہی عجیب وغریب جانور ہے۔قدرت نے اس کی حفاظت کے لئے زرہ بکتر جیسی کھال عطا کی ہے۔ دیکھنے میں تو یہ لڑاکا نظر آتا ہے۔مگر بڑا ہوشیار جانور ہے اس کی پشت پر چاقو بھی رگڑیں تو حرکت نہیں کرتا۔ایک صفت بڑی عجیب ہے جب بھاگنے کا راستہ نہیں ملتا اور خطرہ بالکل سامنے ہوتا ہے تو یہ اپنے لچکدار جسم کو گیند کی شکل کا بنالیتا ہے۔چھوٹے چھوٹے پیروں کو اس طرح سمیٹ لیتا ہے کہ وہ بالکل نظر نہیں آتے۔ بس لوہے کے گولے جیسا بن جاتا ہے۔ اپنے دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس کے قریب سے آسانی سے لڑھکتا ہوا گزر جاتا ہے۔اس جانور کے ایک وقت میں چار بچے پیدا ہوتے ہیں اور چاروں کی جنس ایک ہوتی ہے یعنی چاروں مادہ یا چاروں نر۔

■

M Yusuf Ansari,368, New Ward
Malegaon, Nasik, MAHA.-423203



نانی کے صندوق سے

آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ نانی کاایک پرانا صندوق ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔اف! کیاغضب کا صندوق ہے۔ مزیدار چیزوں‌سے بھرا ہوا۔ کھانیا ں، چٹکلے ، پیاری پیاری نظمیں، مزے مزے کی باتیں ، دنیا جہان کے قصے..تو بھئی .ہم یہ کریں گے کہ ہر مہینے اس صندوق سے کچھ پرانی چیزں نکالیں گے اور 'بچوں کی دنیا' میں سجادیں گے۔ صندوق میں چونکہ تالا نہیں ہے اس لیے ہو سکتاہے کچھ پرانی چیزیں اوروں نے بھی اس میں سے نکا لی ہوں۔ اگر ایسی کوئی مزے دار چیز آپ کے ہاتھ لگے تو ہمارے پاس بھیج دیجیے۔چھپا کر نہ رکھئے گا! ہم اسے آپ کے نام کا حوالہ دے کر چھاپ دیں گے ! مدیر

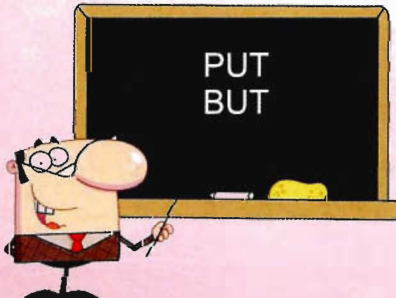
راجہ مہدی علی خاں (مرحوم)

تو میں کیا کروں؟



سکندر نے پورس سے کی تھی لڑائی، جو کی تھی لڑائی تو میں کیا کروں
جوکورو نے پانڈو سے کی ہاتھا پائی، جو کی ہاتھا پائی تو میں کیا کروں
جو پی یوٹی پُٹ ہے، تو بی یوٹی بٹ ہے زمانے کا دستور کتنا الٹ ہے
پڑھاتے ہیں سب مجھ کو الٹی پڑھائی، ہے الٹی پڑھائی تو میں کیا کروں

ہے جاہل گھسیٹا مگر کھائے حلوا، یہ ہر روز لوٹے مٹھائی کا جلوا
یہ دودھ میں پانی ملاتا ہے بھائی، نہ آئے ملائی تو میں کیا کروں
یہ بی اے ہے لیکن چلائے یہ ٹھیلا، یہ ایم اے ہے لیکن یہ بیچے کریلا
اگر تین دن سے یہ بھوکا ہے بھائی جو بھوکا ہے بھائی تو میں کیا کروں
یہ سورج جو شام و سحر گھومتا ہے، اسے گھومنے دو اگر گھومتا ہے
زمیں گول اگر ہے تو ہونے دو بھائی، جو چپٹی ہے بھائی تو میں کیا کروں



■ گلشن باورا (مرحوم)



جیب کترے کی دعا

اوپر والے تری دنیا میں کبھی جیب کسی کی نہ خالی ملے
کوئی بھی غریب نہ ہو جگ میں ہر پاکٹ میں ہریالی ملے
ہندومسلم سکھ عیسائی، سب کی جیبوں میں پیسے ہوں
اپنی نظروں میں اے مالک سب کے سب ہی اک جیسے ہوں
کبھی ہار گلے کا مل جائے کبھی کانوں کی ہمیں بالی ملے
اتنی سی دیا کرنا داتا ہمیں سدا بچانا وردی سے
پالا نہ کبھی بھی پڑے اپنا کسی ظالم یا بے دردی سے
سب خوش رہیں سب کے ساتھ ساتھ ہم کو بھی ذرا خوش حالی ملے

اوپر والے سن لے نیچے والوں کی پکار
جن کو دودیتاہے مالک ان کو دینا چار
آدھا ان سے ہم لے لیں گے ہوجائے بیڑا پار
ویسے تو سب کچھ ہے تیرا جگ کے پالن ہار

دیکھو یہ اپنا دھندا
مالک نہ کرنا مندا
دیتے رہنا یوں چندا
کبھی ملے نہ کڑ کا بندہ
ہم بھلا برا کیا جانیں
ہیں اپنی یہی دعائیں

اوپر والے تری دنیا میں کبھی جیب کسی کی نہ خالی ملے
کوئی بھی غریب نہ ہو جگ میں ہر پاکٹ میں ہریالی ملے



پڑھتے جاؤ ہنستے جاؤ



جج: مجھے سیدھا جواب دو، تم نے جرم کیا ہے یا نہیں؟
ملزم: جناب اگر فیصلہ مجھے ہی کرنا ہے تو آپ اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں!



• ایک پاگل نے دوسرے پاگل سے پوچھا: اگر پیڑ پر چڑھا ہوا ہاتھی نیچے اترنا چاہے تو اسے کیا کرنا چاہئے؟
دوسرے پاگل نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا: اسے چاہئے کہ کسی پتے پر بیٹھ کر پت جھڑ کا انتظار کرے۔

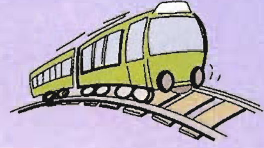


ایک دوست: آج کل کے لڑکے لڑکیوں جیسے فیشن کیوں کرنے لگے ہیں؟
دوسرا دوست: اس لیے کہ بہنوں کے لیے خریدی ہوئی چیزیں مفت مل جاتی ہیں۔



• ایک شخص دکان میں آ کر بولا: ڈاکٹر صاحب مجھے چشمے کی سخت ضرورت ہے۔
دُکان دار نے کہا: آپ کی ضرورت واقعی سخت ہے کیونکہ یہ عینکوں کی نہیں مٹھائی کی دُکان ہے!

• ایک ٹرین بہت ہی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس بیچ ایک گارڈ ڈبّے میں آیا اور بولا ''جو مسافر بھاگل پور جارہے ہیں انھیں بے حد افسوس سے اطلاع دی جاتی ہے کہ بھاگل پور کا اسٹیشن پوری طرح تباہ ہوگیا ہے کیونکہ وہاں آگ لگ گئی ہے۔''



کچھ دیر خاموشی رہی۔ ایک مسافر نے سب کو تسلی دی کہ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جب تک ہم وہاں پہنچیں گے تب تک اسٹیشن دوبارہ بن کر تیار ہو چکا ہوگا۔"

استاد (شاگرد سے): اتنی دیر سے کیوں اسکول آئے؟



شاگرد: جناب راستے میں اتنی کیچڑ تھی کہ ایک قدم آگے رکھتا تو دو قدم پیچھے چلا جاتا۔

استاد: تو پھر اسکول کیسے پہنچے؟

شاگرد: میں نے اپنا منھ گھر کی طرف کر لیا!



بھکاری: بابو جی میری مدد کیجیے۔ میرے مکان میں آگ لگ گئی اور میرا سامان روپیہ پیسہ سب اس میں جل گیا۔

بابو جی: مکان جلنے کا کوئی ثبوت ہے تمھارے پاس؟

بھکاری: ثبوت تو تھا مگر وہ بھی مکان کے ساتھ جل گیا!



لڑکا: اگر میں وقت ہوتا تو لوگ میری کتنی قدر کرتے۔

لڑکی: بالکل نہیں۔ لوگ تمھیں دیکھ کر ڈر جاتے۔

لڑکا: وہ کیوں؟

لڑکی: لوگ تمھیں دیکھتے ہی کہتے، وہ دیکھو، برا وقت آ رہا ہے۔



مسافر (رکشہ والے سے): ریلوے اسٹیشن تک جانے کا کیا لوگے۔

رکشہ والا: دس روپے۔

مسافر: اور سامان کے؟

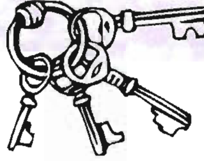
رکشہ والا: وہ فری ہے۔

مسافر: تو پھر ایسا کرو میرا سامان لے چلو میں پیدل آتا ہوں!



استاد (شاگرد سے): بتاؤ آسمانی بجلی اور گھر کی بجلی میں کیا فرق ہوتا ہے؟

شاگرد: سر آسمانی بجلی کا بل نہیں آتا۔



• مالک نئے نوکر کو کسی بات پر ڈانٹنے کے بعد بولا: میں نے تم پر اتنا بھروسہ کیا کہ مکان کی ساری چابیاں تمھارے حوالے کر دیں اور تم ہو کہ ٹھیک سے کام نہیں کرتے۔

اس پر نوکر نے جھلّا کر کہا: کیا خاک بھروسہ کیا ہے۔ نہ ان سے تجوری کھلتی ہے نہ بیگم صاحبہ کی الماری کا تالا!



مالک (نوکر سے): مجھے شام پانچ بجے جگا دینا۔

نوکر: حضور پانچ بج چکے ہیں۔

مالک: تو پھر میری شکل کیا دیکھ رہا ہے۔ جگاتا کیوں نہیں؟



• منّے نے ماں سے پوچھا، امّی نل میں پانی کہاں سے آتا ہے؟

ماں نے بتایا: بیٹا ہر طرح کا پانی دریا سے ہی آتا ہے۔ ایک دن منّا اور اس کے والد دریا کی سیر کو گئے۔ اتفاق سے پاؤں پھسلا اور والد دریا میں گر گئے۔ منّا بھاگا بھاگا گھر پہنچا اور ماں سے بولا، امّی جلدی سے نل کھول دیں، ابّا جان آ رہے ہیں۔



ایک دوست: اگر دنیا میں پانی ختم ہو جائے تو کیا ہوگا؟

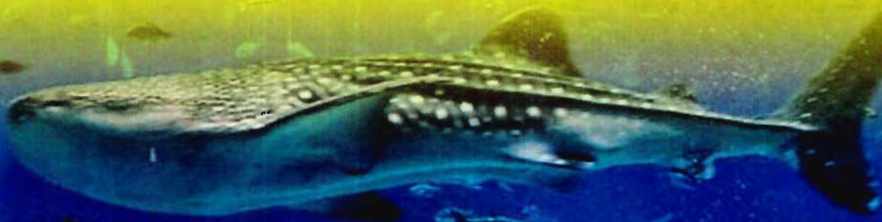
دوسرا دوست: کم سے کم دودھ تو خالص ملا کرے گا!■

■ محمد ہارون سیٹھ سلیم

مچھلیاں واٹر ٹینک میں



مچھلیوں کو تیرتا جو دیکھا واٹر ٹینک میں
تیرنے کو میرا دل بھی چاہا واٹر ٹینک میں
جھانک کر جب ہم نے دیکھا، ہے کیا واٹر ٹینک میں
ہوچکا تھا پیرہن تر، اپنا واٹر ٹینک میں
پاک تھا پانی وہ سارا، صاف اور شفاف تھا
ایک قطرہ بھی نہیں تھا، میلا واٹر ٹینک میں
چاندی سونے جیسا ساری مچھلیوں کا رنگ تھا
رنگ بے رنگ ایک بھی نہ دیکھا واٹر ٹینک میں
مجھ سے میرے بال بچے پوچھتے ہیں بار بار
مچھلیوں کے بال بچے ہیں کیا واٹر ٹینک میں؟
مچھلیوں سے سارا واٹر ٹینک جو معمور ہے
رہتا ہوگا ان کا سارا کنبہ واٹر ٹینک میں
مچھلیوں میں ہے نہ کوئی باہمی جھگڑا فساد
دیکھنے کا ہے یہ منظر پیارا واٹر ٹینک میں
کھیلنے میں تھیں بڑی بدمست ساری مچھلیاں
لطف ان کو آرہا تھا کتنا واٹر ٹینک میں
مچھلیوں کو انس ہے جو اپنے واٹر ٹینک سے
کچھ نہ کچھ تو راز پنہاں ہوگا واٹر ٹینک میں
وہ نہیں آئیں گی واٹر ٹینک سے باہر سلیم
مچھلیوں کا ہے اثاثہ سارا واٹر ٹینک میں







تتلی تتلی، اے تتلی

تتلی تتلی، اے تتلی، ہے تیری کمر کیا پتلی
کمرے میں تھی بند ابھی تک بتا کہاں سے نکلی
رنگ برنگے پنکھ ہیں تیرے بالکل حور پری جیسے
کبھی لگے تو کالی پیلی، کبھی لگے تو اجلی
چرخ تلک تو اڑ سکتی ہے مڑ سکتی ہے کھڑ سکتی ہے
فطرت کے ہیں کھیل یہ سارے ہے یہ کرشمہ اصلی
بچوں سے تو بچ کے رہنا، ان کے ہاتھ نہیں لگنا
ہاتھ اگر لگ جائے گی تو، مرجائے گی پگلی
مسل کے وہ رکھ دیں گے تجھ کو جان تری لے لیں گے
تڑپ تڑپ کے مرجائے گی، جیسے جل بن مچھلی
کوئی کبھی گر تجھ کو چھیڑے بری نظر سے دیکھے
توڑ کے اک دن رکھ دوں گا میں اس کی ہڈی پسلی
چمن چمن کی سیر کرے تو شیدائی پھولوں کی
غنچہ و گل سے تیرا رشتہ، اصلی ہے یا نقلی
اک پل کے لئے تو آتی ہے، فی الفور چلی جاتی ہے
پھرتی سے تو اڑ جاتی ہے، دل پہ گرا کے بجلی
ہے رشک سلیم ناداں کو، جب تجھ کو اڑتی دیکھے
دور گگن میں اڑ جانے کی دل میں تمنا مچلی







■ **M Haroon Sait Saleem** ,2/3Spencer Road, Fraser Town, Bangalore-560005

جولز ورنے



جولز گیبرئیل ورنے Jules Gabriel Verne دنیا میں‌سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناول نگاروں میں شامل فرانسیسی مصنف ، شاعراور ڈرامہ نویس تھے۔سائنسی کہانیاں لکھنے میں ان کا جواب نہیں تھا۔ عالمی ادب میں انہیں فادر آف سائنس فکشن کہا جاتا ہے۔ جاسوسی ناول لکھنے والی مصنفہ اگاتھا کرسٹی کے بعد جولز ورنے دنیا کے دوسرے مصنف ہیں جن کی کتابوں کا سب سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر مہماتی adventurous ناول لکھے ہیں جن میں زمین کے اندر، سمندر میں اور زمین کے اوپر کئے گئے سفروں کی حیرت انگیز داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ ان کے کئی ناولوں پر فلمیں بن چکی ہیں۔ان میں اراؤنڈ دی ورلڈ ان ایٹی ڈیز Around the World in Eighty Days کو سب سے مقبول مانا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسے شریف انسان فلیس فوگ Phileas Fogg کی مہم جوئی کا قصہ ہے جو رحم دل ، بہادر اور وقت کا کسی سنکی آدمی سے بھی زیادہ پابند انسان ہے۔ لندن کے ایک کلب میں وہ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کے ایک ایسے زمانے میں صرف اسّی دن کے اندر دنیا کا پورا ایک چکّر لگانے کا چیلنج قبول کر لیتا ہے جب ہوائی جہاز اور موٹریں نہیں تھی اور پانی کے جہاز بھی بھاپ سے چلتے تھے۔ جیسے ہی فلیس فوگ اپنے فرانسیسی خادم ژاں پاس پرٹو Jean Passepartout کو ساتھ لے کر شرط کے مطابق اپنا سفر شروع کرتا ہے پولیس اسے ڈاکو سمجھ کر پیچھے لگ جاتی ہے اور یوں طرح طرح کی روکلوٹوں سے بھرا اس کا سفر بالآخر مکمل ہوتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وقت کے معاملے میں پہلی مرتبہ فلیس فوگ سے ایک غلطی ہوگئی ہے اور وہ بظاہر شرط ہار جاتا ہے۔ لیکن تبھی ایک حیرت انگیز سچّائی سامنے آتی ہے اور فلیس فوگ شرط جیت لیتا ہے۔ قومی اردو کونسل نے اس کتاب کی تلخیص چھاپی ہے جسے آپ کی دل چسپی کے لیے ہم سلسلہ وار پیش کررہے ہیں۔ ناول اتنا دل چسپ ہے کہ آپ اگلی قسط کے لیے بے چین ہو اٹھیں گے۔ تو لیجیے حاضر ہے ناول 'اسّی دن میں دنیا کا سفر' کی پہلی قسط، جسے 'اَسّی دن' کا مختصر نام دیا گیا ہے۔ مدیر

آقا اور ملازم کی ملاقات

یہ 1872 کی بات ہے۔ انگلستان کی راجدھانی لندن میں ایک مالدار شخص فلیس فوگ رہتا تھا۔ اس کے بارے میں سب اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ ایک نہایت شریف اور خوش اخلاق آدمی تھا اس کے سوا لوگوں کو اس کی اور کسی بات کا علم نہ تھا۔ وہ دوسروں سے بہت کم ملتا جلتا اور بلاضرورت کسی سے بات بھی نہ کرتا، اسی وجہ سے وہ ایک پُراسرار شخصیت بن گیا تھا۔ نہ تو کبھی وہ کسی بنک میں دکھائی دیتا نہ کسی عدالت میں، یہاں تک کہ وہ شہر کے کسی دفتر میں بھی کبھی نظر نہ آتا۔ نہ کوئی تاجر تھا، نہ ادیب، نہ سائنس داں! تو پھر وہ آخر کرتا کیا تھا؟ اس کی آمدنی کا ذریعہ کیا تھا؟ ہاں وہ 'ریفارم کلب' کا ایک ممبر ضرور تھا بس اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ سچ پوچھو تو دولت اس کے گھر کی لونڈی تھی۔ مگر اتنی ساری دولت اس کے پاس آئی کہاں سے؟ آخر وہ کیسے لاکھوں روپوں کا مالک بن بیٹھا؟ یہ سب ایک راز سے کم نہ تھا اور یہ راز فلیس فوگ شاید ہی مرتے دم تک کسی پر ظاہر کرتا۔ کیونکہ چوبیس گھنٹے اس کی زبان پر تالا جو لگا رہتا۔ ان عجیب وغریب عادتوں کی وجہ سے ہی اس کی زندگی سب کے لئے ایک معمہ بنی ہوئی تھی اور لوگوں کے دل میں طرح طرح کے سوالات اٹھ کھڑے ہوتے۔

کیا اس نے کبھی سفر بھی کیا تھا؟ کوئی عجب نہیں، کبھی کیا ہوا، کیوں کہ ساری دنیا کے حالات کے بارے میں شاید ہی اس سے بڑھ کر کوئی واقف رہا ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ دنیا کی کوئی ایسی جگہ نہیں تھی، چاہے اپنے ملک میں ہو یا سات سمندر پار، جسے وہ اچھی طرح جانتا نہ ہو۔ ان ساری باتوں کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا تھا کہ سچ مچ تو نہیں البتہ خواب میں اس نے ضرور کئی چھوٹے بڑے سفر کیے ہوں گے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فلیس فوگ نے کبھی شہر لندن سے باہر قدم ہی نہیں رکھا تھا۔ وہ بلاناغہ ہر روز صرف اپنے کلب جاتا، جہاں اس کا سارا وقت اخبارات پڑھنے اور تاش کھیلنے میں گزرتا۔ تاش کے کھیل میں اکثر جیت اسی کی ہوتی۔ لیکن مزے کی بات تو یہ تھی کہ تاش میں وہ جو کچھ جیتتا سب خیرات کر دیتا۔ کلب کا ہر شخص یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ تاش کبھی جیتنے کی غرض سے نہیں بلکہ صرف کھیل کی خاطر کھیلتا تھا۔

ایک بڑے سے مکان میں وہ اکیلا ہی رہتا تھا، نہ بیوی نہ بچے نہ کوئی قریبی دوست یا رشتہ دار۔ یہاں تک کہ وہ دوپہر اور شام کا کھانا بھی روزانہ 'ریفارم کلب' میں ایک خاص میز پر اکیلے ہی کھاتا۔ بڑی اصولی زندگی تھی اس کی۔ اس کے ہر کام میں ایک باقاعدگی تھی۔ ہر روز کلب سے رات کے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے چل پڑتا اور گھر پہنچتے پہنچتے بارہ بج جاتے۔ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے آدھا وقت تو کلب ہی میں گزرتا اور رہا آدھا تو وہ گھر پر۔

فلیس فوگ کی خدمت کے لئے صرف ایک ملازم تھا، جسے اپنے آقا کے کڑے اصولوں کی سختی سے پابندی کرنی پڑتی۔ سارے کام مشین کی طرح قاعدے سے کرنے پڑتے۔ کوئی بات مالک کی مرضی کے خلاف ہوتی تو ہر گھڑی نوکری سے نکال دیئے جانے کا ڈر لگا رہتا۔ 2 اکتوبر کو بے چارے نوکر کی شامت جو آئی تو اس نے مالک کو حجامت کے لئے روز کی طرح 86 ڈگری کی بجائے 84 ڈگری کا گرم پانی لا کر دے دیا۔ صرف دو ڈگری کا فرق ہوا تو صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا اور بس اتنی سی بات پر کھڑے کھڑے ملازم کو برطرف کر دیا اور اسی روز دوسرے آدمی کو نوکری کے لئے بلا لیا گیا۔



فلیس فوگ ہر روز، دن کے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے گھر سے کلب روانہ ہو جاتا۔ اس روز وہ نئے ملازم کا انتظار کر رہا تھا اور بار بار گھڑی کی سوئیوں پر نظر ڈالتا جاتا تھا۔ ایک خاص گھڑی تھی جس میں سیکنڈ، منٹ، گھنٹے، دن اور سال کے الگ الگ نشان تھے۔ اس کی نظر گھڑی پر سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ وہ آرام کرسی پر تن کر بیٹھا تھا۔ دونوں پیر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھ گھٹنوں پر اس طرح

رکھے تھے کہ وہ بالکل کاٹھ کا پتلا معلوم ہوتا تھا۔ ٹھیک اسی وقت، کسی نے باہر کے دروازہ پر کھٹکھٹایا۔ پرانا ملازم اندر داخل ہوا اور اطلاع دی:

''نیا ملازم آیا ہے جناب''

اتنے میں ایک تیس سالہ آدمی اندر داخل ہوا اور جھک کر ادب سے سلام کیا۔

''میں سمجھتا ہوں، تم فرانسیسی ہو؟ اور تمہارا نام جان ہے، نا؟'' فلیس فوگ نے پوچھا۔ اجنبی نے کہا:

''نہیں جناب میرا نام ژاں پاس پرٹو ہے اور بھونڈا سا لفظ پاس پرٹو، اس لئے جوڑ دیا گیا کہ میں ہر مشکل سے صاف بچ نکلتا ہوں۔ ویسے تو میں نے اس پاپی پیٹ کے خاطر بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ لیکن جناب میں ایک ایمان دار آدمی ہوں۔ گلی کوچوں میں گاتا رہا۔ سرکس میں نہ صرف اچھل کود کی بلکہ رسی پر کمالات دکھائے۔ میں سارے تماشے کر چکا ہوں۔ پھر کچھ دن کے لئے جمناسٹک کا استاد بن گیا تھا۔ اس کے بعد پیرس میں فائر بریگیڈ میں نوکری کر لی اور کئی مرتبہ اپنی جان پر کھیل کر خطرناک آگ بجھاتا رہا۔ پانچ سال پہلے فرانس سے چلا آیا اور انگلستان میں آپ کی طرح کھاتے پیتے لوگوں کے پاس گھریلو ملازمت کر لی۔ پھر بے روزگار ہو گیا تو فلیس فوگ جیسے شریف آدمی کا نام سن کر اس خیال سے چلا آیا کہ اطمینان اور سکون سے ایک جگہ رہ کر آپ کی خدمت کر سکوں۔''

یہ سن کر فلیس فوگ نے کہا: ''ہاں تم میرے پاس نوکری کے قابل ہو اور پھر مجھے کچھ دوسروں نے بھی بتایا ہے کہ تم ایک ایماندار آدمی ہو۔ تو تم میری شرائط جانتے ہو نا؟''

''ہاں جناب'' جین نے جواب دیا۔

فلیس فوگ نے کہا ''بہت خوب، اچھا اس وقت کیا بجا ہے؟'' پاس پرٹو نے اپنی جیب سے چاندی کی ایک بڑی سی گھڑی نکالی اور دیکھ کر کہا:

''گیارہ بج کر پچیس منٹ، جناب۔''

فلیس فوگ نے برہم ہو کر کہا: ''کیا کہا، گیارہ بج کر پچیس منٹ! تمہاری گھڑی بہت پیچھے ہے۔''

اس پر پاس پرٹو بولا ''معاف کیجئے، جناب یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔''

فلیس فوگ نے اپنی گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا: ''تمہاری گھڑی چار منٹ پیچھے ہے۔ خیر، اسی لمحہ یعنی گیارہ بج کر انتیس منٹ پر بدھ کے دن 2 اکتوبر 1872 سے تم میرے ملازم ہو۔'' وہ کرسی سے اٹھا بائیں ہاتھ سے اپنا ہیٹ اٹھایا، سر پر رکھا اور کچھ کہے بغیر ہی باہر نکل گیا۔

پاس پرٹو نے اسی وقت باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ اس کا نیا آقا کلب جا رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے پھر دروازہ بند ہونے کی آواز کانوں میں آئی۔ پرانا ملازم جیمس فوسٹر رخصت ہو رہا تھا۔ اب پاس پرٹو اس مکان میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ فلیس فوگ اور ژاں پاس پرٹو۔



پاس پرٹو کی فلیس فوگ سے یہ چھوٹی سی ملاقات تھی مگر وہ اتنے تھوڑے سے وقت میں ہی اپنے نئے آقا کو اچھی طرح پہچان گیا۔

فلیس فوگ کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی۔ تیکھے خد وخال، لانبا قد، خوبصورت بال، چمکیلے دانت، چہرہ پر جھریوں کا نشان تک نہ تھا۔ مزاج میں نہ زیادہ سختی نہ نرمی۔ اعتدال پسند تھا۔ حالانکہ دولت کی کچھ کمی نہ تھی لیکن وہ فضول خرچی سے باز رہتا تھا۔ ہر کام میں مستعدی دکھلاتا، وقت کا بڑا پابند، دھن کا پکا۔ ہمیشہ صحیح فیصلے کرتا تھا۔ ہر کام بہت سوچ سمجھ کر کرتا جس میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور پوشیدہ ہوتا۔ یہاں تک کہ ایک لفظ بھی بیکار زبان سے نہ نکالتا نہ ایک قدم بیکار اٹھاتا۔ کبھی کسی نے اسے پریشانی یا غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ اس سے کوسوں دور تھی۔ کبھی جلد بازی سے کام نہ لیتا، پھر بھی اس کے سارے کام وقت پر ہوتے تھے۔ وہ اکیلا ہی رہنا پسند کرتا تھا تا کہ اس کے کسی کام میں ہرج نہ ہو۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ زندگی میں کبھی کبھی لڑائی جھگڑے اور اختلافات بھی ہوا کرتے ہیں اور ان سے بچنے کا ایک آسان علاج یہی ہے کہ لوگوں سے زیادہ میل ملاپ نہ رکھا جائے۔

پاس پرٹو کئی سالوں سے ایسے ہی آدمی کی تلاش میں تھا۔ اس نے جیسا سوچ رکھا تھا آخر ویسا ہی آقا اس کو مل گیا۔ پاس پرٹو ایک سیدھا سادا، مخلص اور نیک دل آدمی تھا۔ گٹھا ہوا جسم، چوڑا چکلا سینہ، گول چہرے پر نیلی نیلی آنکھیں بڑی بھلی لگتی تھیں۔ اس کے بھورے بھورے ملائم بال ہمیشہ بکھیرے رہتے، جو کنگھی کے دو تین ہاتھ چلانے سے ہی سنور جاتے تھے۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ پاس پرٹو کی یہ سادہ طبیعت، نئے آقا سے میل کھائے گی یا نہیں؟ کیا پاس پرٹو اپنے آقا کے ان سخت اصولوں کی پابندی کر سکے گا؟ اس سے پہلے پاس پرٹو نے آٹھ دس جگہ نوکری کی تھی، لیکن اپنے آقاؤں کو خوش کرنا اس کے لئے بہت مشکل ثابت ہوا تھا کیوں کہ وہ سب سفر کے شوقین اور سیر وتفریح کے دلدادہ تھے۔ یہ ساری باتیں پاس پرٹو کو پسند نہ آتی تھیں۔ اس کا لڑکپن اور جوانی بس خانہ بدوشی ہی میں گزرے تھے۔ اس لئے اب وہ ایک ٹھکانہ بنا کر آرام سے رہنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ فلیس فوگ سے شاید اس کی نبھ جائے۔ کیوں کہ اس کا نیا آقا اپنے اصولوں کا پابند اور ایک سلیقہ مند آدمی تھا۔

ساڑھے گیارہ بج چکے تھے، پاس پرٹو نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سارے گھر کا جائزہ لیا۔ مکان بہت صاف ستھرا تھا اور ہر چیز اپنی اپنی جگہ سلیقہ سے رکھی ہوئی تھی۔ پھر وہ تیسری منزل پر اس کمرے کو دیکھنے کے لئے گیا جو اس کی رہائش کے لئے دیا گیا تھا اس کمرے میں ملازم کو بلانے کے لئے بجلی کی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ اور بات چیت کرنے کے لئے نلکیاں بھی لگی تھیں جو مالک کے کمرے سے ملی ہوئی تھیں۔ آتش دان پر بجلی سے چلنے والی گھڑی رکھی تھی۔ جس کا وقت فلیس فوگ کے سونے کے کمرے کی گھڑی سے ایسا ملا ہوا تھا گویا دو دل ایک ساتھ دھڑک رہے ہوں۔ یہاں اگر سیکنڈ کی سوئی نے حرکت کی تو وہاں ٹک سے سیکنڈ کی سوئی خود بخود آگے کو بڑھ جاتی۔ پھر پاس پرٹو کی نظر گھڑی کے اوپر دیوار سے لٹکے ہوئے اس کارڈ پر پڑی جس پر دن اور رات کے ایک ایک منٹ کا ٹائم ٹیبل بنا ہوا تھا۔ صبح آٹھ بجے سے دن کے ساڑھے گیارہ بجے تک اور پھر رات کے ساڑھے گیارہ بجے سے سونے تک چھوٹے چھوٹے کام کے بارے میں لکھا ہوا تھا۔

8 بج کر 23 منٹ پر	چائے اور ٹوسٹ
9 بج کر 37 منٹ پر	حجامت کے لئے پانی
10 بج کر 20 منٹ پر	غسل وغیرہ

جب پاس پرٹو نے اس ٹائم ٹیبل کا ایک ایک لفظ پڑھا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ دیر تک ایک ایک بات پر غور کرتا رہا۔ اسے ٹائم ٹیبل سے پتہ چلا کہ فلیس فوگ کے کلب سے گھر آتے آتے آدھا گھنٹہ لگ جاتا ہے اور پھر وہ ٹھیک بارہ بجے بستر پر دراز ہو جاتا ہے۔

ابھی پاس پرٹو یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر فلیس فوگ کے کپڑوں پر پڑی جو بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ پتلون، کوٹ اور واسکٹ پر ایک ایک نمبر لگا ہوا تھا۔ پاس ہی دیوار پر ایک کارڈ لٹکا ہوا تھا جس پر لکھا تھا کہ کس موسم میں، کس دن، کس وقت کون سا سوٹ پہنا جائے گا۔ اسی طرح کا ایک اور ٹائم ٹیبل بوٹوں اور جوتوں کے لئے بھی بنا ہوا تھا۔



فلیس فوگ کے سونے کے کمرے میں ایک تجوری بھی تھی جس میں چوری اور آگ سے بچاؤ کے لئے قیمتی چیزیں رکھی جا سکتی تھیں۔ گھر میں ایسا کوئی ہتھیار نہ تھا جس سے پتہ چلے کہ مالک مکان شکار کا شوقین ہے یا فنِ سپہ گری کا ماہر۔ البتہ ہر چیز سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس مکان میں ایک نیک، شریف اور امن پسند آدمی رہتا ہے۔ پاس پرٹو جب پورے گھر کا اچھی طرح معائنہ کر چکا تو خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اسے ایک قسم کا دلی سکون محسوس ہوا اور اس نے دل ہی دل میں بار بار کہا:

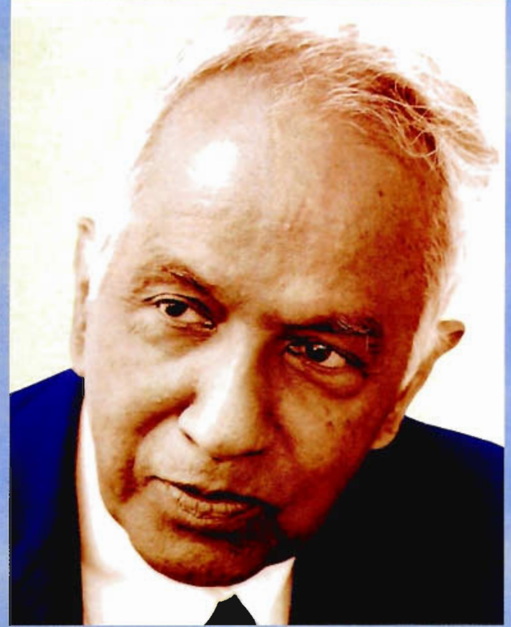
''مجھے ایسے ہی آقا کی تلاش تھی، یہی وہ گھر ہے جہاں میں اپنا ڈیرا جمانا چاہتا تھا۔ اب فلیس فوگ اور میں، دونوں ہنسی خوشی اسی گھر میں رہیں گے۔'' جاری ■■

■ سعید رحمانی

اک زمیں اور بھی ہے

ویسے سچ تو یہ ہے کہ ہماری زمین جیسی ایک نہیں بلکہ کئی زمینیں اس لمبی چوڑی کائنات میں پائے جانے کی خبریں مل چکی ہیں۔ حال ہی میں 13 اپریل کو امریکہ کی قومی خلائی ایجنسی ناساNASA یعنی نیشنل ایرونا ٹکس اینڈ اسپیس ایڈمنسٹریشن National Aeronautics and Space Administration نے اعلان کیا کہ اس کے کیپلر مشنKepler Mission نے خلا میں ہماری زمین جیسے دو اور سیاروں کا پتہ لگایا ہے جن کے نام کیپلر 66ای اور کیپلر 66بی رکھے گئے ہیں۔ زمین سے ان سیاروں کا فاصلہ 1200 نوری سال کا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص روشنی کی رفتار (ایک سیکنڈ میں تقریباً3 لاکھ کلومیٹر کی رفتار) سے سفر کرے تو وہ 1200 برس میں وہاں پہنچ پائے گا جو کسی بھی ایک شخص کی زندگی میں ناممکن ہے۔ جس سورج کے خاندان یا نظام شمسی میں یہ سیارے گھوم رہے ہیں اس کا نام کیپلر 66 ہے اور اس کے خاندان میں کل پانچ سیارے ہیں۔ اب آپ پوچھیں گے یہ کیپلر مشن کیا چیز ہے۔ تو دوستو دراصل کیپلر کے نام سے ایک خلائی دوربین ہماری خلا میں گھوم رہی ہے جس کا کام ہے زمین جیسے ان سیاروں کا پتہ لگانا جو ہماری کہکشاں 'ملکی وے Milky Way' یعنی 'آکاش گنگا' میں گھوم رہے ہیں۔ اس پر ایک تفصیلی مضمون ہم آپ کو پھر کبھی پڑھوائیں گے، فی الحال اتنا جان لیجیے کہ اس مضمون میں جس سیارے کیپلر 22بی کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی موجودگی کا اعلان 5 دسمبر 2011 کو ہوا تھا۔ یہ سیارہ زمین سے 600 نوری سال کی دوری پر ہے۔ ادارہ

ہمارے سائنسداں بہت دنوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کیا کس سیارے میں بھی جاندار بستے ہیں یا کوئی ایسا سیارہ ہے جہاں زندگی پیدا ہوسکتی ہیں۔ خاص طور سے زہرہVenus اور مریخMars پر اُن کی توجہ مرکوز ہے۔ درمیان میں یہ دعوے بھی کئے جاتے رہے ہیں کہ فلاں سیارے میں پانی کے آثار موجود ہیں اس لئے وہاں جانداروں کا ہونا بھی ممکن ہے۔ ہندوستان



ڈاکٹر سبرامنین چندر شیکھر

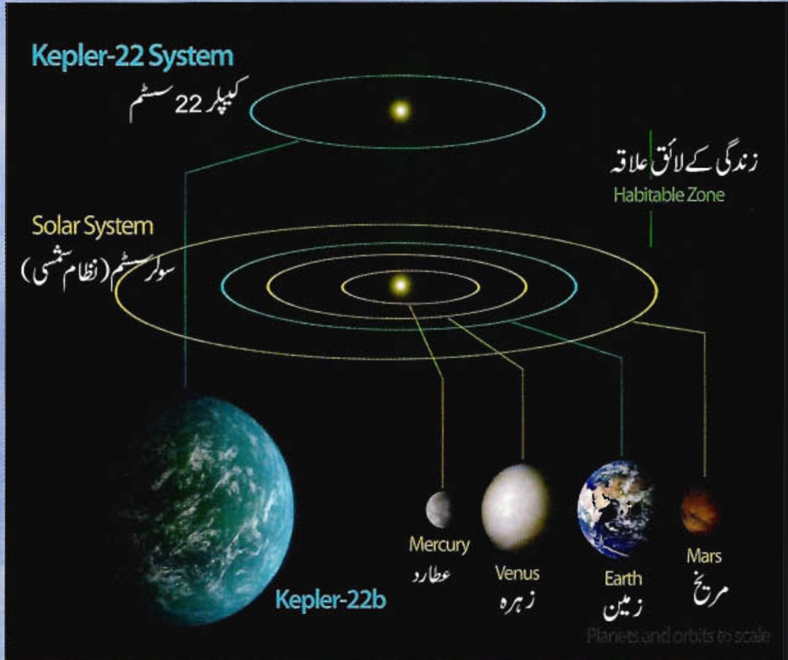
کے ایک معروف سائنسداں سبرامنین چندر شیکھر نے بھی انکشاف کیا ہے کہ خلاSpace میں کہیں نہ کہیں ایک دوسرا کرۂ ارض یا زمین Earth موجود ہے۔ خلائی سائنسدانوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ سمندر کے کنارے ریت کے جتنے ذرّے ہیں پوری کائنات میں اسی مقدار سے سیارے اور ستارے بکھرے ہوئے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ بھی پوری طرح ممکن ہے کہ خلا میں ہماری زمین کا ہم شکل یا دوسرا ایک کرۂ ارض موجود ہو۔ اسی طرح کے خیالات کی بنیاد پر ان گنت سائنسی ناول لکھے جا چکے ہیں اور فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔ لیکن اب تک ایسی کسی زمین یا کرۂ ارض کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے جب یہ خبر اخبارات کی سرخیوں میں آئی کہ خلا میں ایک دوسرے کرۂ ارض کا پتہ لگا لیا گیا ہے تو لوگوں میں ایک طرح کا جوش وخروش نظر آنے لگا کیوں کہ اس دریافت سے قدرت کے اور بھی کئی راز سامنے آسکتے ہیں۔ اس زمین کا نام کیپلر 22بی Kepler 22B رکھا گیا ہے۔ جس کی شکل لگ بھگ ہماری زمین جیسی ہے اور جس میں زندگی بھی پائی جاسکتی ہے۔ بس سمجھ لیجئے کہ وہ ہماری زمین کی جڑواں بہن ہے۔ اس کی جسامت ہماری زمین سے ڈھائی گنا ہے۔ اس کا اپنا نظامِ شمسی Solar System بھی ہے۔ وہاں کا سورج ہو بہو ہمارے سورج جیسا ہے۔ جس کے گرد اپنے مدار میں چکر لگانے کے لئے جڑواں زمین کو 290 دن لگتے ہیں۔ اپنے سورج سے اس کا فاصلہ بھی تقریباً وہی ہے جو ہماری زمین کا ہمارے سورج سے ہے۔ اس لئے گمان کیا جاتا ہے کہ وہاں کا درجہ حرارت بھی ہماری زمین کے برابر ہوگا جس میں جانداروں کے پیدا ہونے اور پرورش پانے کے تمام حالات موجود ہوں گے۔ ان باتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اگر اب تک وہاں زندگی کے آثار نہیں پائے جاتے تو زندگی شروع ہونے کی امید تو کی ہی جاسکتی ہے۔ کیپلر 22بی کی دریافت کے بعد امید پیدا ہو چلی ہے کہ لوگوں کو رہنے کے لئے ایک نئی جگہ مل جائے گی۔ خلا میں انسانی بستیاں بسانے کے خیال کو سامنے رکھ کر کئی فلمیں بنائی جا چکی ہیں جن میں سے کچھ آپ نے بھی دیکھی ہوں گی۔

جیمس کیمرون کی فلم 'اوتار' اس سلسلے کی تازہ ترین فلم ہے۔ انسانی



جیمس کیمرون کی فلم 'اوتار' کا ایک منظر



سے چلتی ہیں۔ کچھ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ تھیوری کے لحاظ سے یہ ممکن ہے۔لیکن اس تھیوری کو عمل میں کیسے اور کب تک لایا جاسکے گا یہ ایک بڑا سوال ہے جس کا جواب ابھی ہمارے پاس نہیں ہے۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے ایک دلچسپ خبر آپ کو بھی سناتا چلوں۔ چند مہینوں پہلے خبارات میں خبر آئی تھی کہ آگرہ کے کسی شخص نے چاند پر زمین فروخت کرنے کے بہانے بہت سے لوگوں کو ٹھگ لیا ہے۔اس میں ٹھگ کی نیت تو صاف ظاہر ہے مگر ان لوگوں کی معصومیت پر ترس آتا ہے جو چاند پر زمین خریدنے کے لئے کتنے بچین ہیں۔ یہ معصومیت واقعی حیران کن ہے۔ دراصل لالچ وہ بری بلا ہے جو انسان کو پاگل بنائے رکھتی ہے۔آگرہ کا یہ واقعہ اس کی ایک روشن مثال ہے۔زمین کا لالچ انسان کے دل میں اس طرح گھر کر چکا ہے کہ وہ چاند پر زمین خریدنے کے لئے بنا سوچے سمجھے تیار ہوجاتا ہے۔بہر حال کیپلر سے متعلق تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ اس کی تحقیقات میں مزید تیزی آگئی ہے اور سائنسداں اس کے جملہ حالات جاننے کے لئے تندہی سے جٹے ہوئے ہیں۔امید ہے کہ آنے والے دنوں میں اس نئی دریافت کی اور بھی واضح تصویر سامنے آئے گی۔اس دوران وہاں اگر زمینی پلاٹ بیچنے کی کوئی خبر اخبارات میں آجائے تو حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔

■

Saeed Rahmani ,Editor, Adabi Mahaz
Dewan bazar,cuttack-753001 (Orissa)

خیالات کی یہ اڑان جتنی خوب صورت لگتی ہے حقیقت اس سے کہیں زیادہ عجیب ہے۔ہماری زمین سے کیپلر کی دوری اتنی زیادہ ہے کہ اس تک پہنچنے کے سادھن ابھی تک ہم جٹا نہیں پائے ہیں۔اب تک کوئی ایسا خلائی جہاز نہیں بنا ہے جس سے کروڑوں میل کی دوری میں طے کی جاسکے۔دراصل یہ دوری پاٹنے کے لئے 600 سال کا سفر روشنی کی رفتار سے طے کرنا پڑے گا، جو ایک انسان کے لئے ناممکن ہے۔ہاں امید کی ایک ہی کرن نظر آتی ہے۔اگر انسان کو برقی لہروں میں تبدیل کرنے کا طریقہ سائنسداں دریافت کرلیں تو یہ سفر آسان ہوجائے گا۔جس طرح تحریریں اور خطوط ای میل اور ایس ایم ایس سے بھیجے جاتے ہیں انسان کو بھی اسی طریقے سے دوسرے سیاروں کو بھیجا جاسکتا ہے۔اس نہج پر بھی تجربات جاری ہیں۔اگر اس میں انسان کامیاب ہوجاتا ہے تو فاصلہ خواہ کتنا بھی کیوں نہ ہواسے پلک جھپکتے طے کرنا کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔لیکن اس کے لیے بھی ایک شرط ہے۔ انسان کو برقی لہروں کی رفتار کو بھی پیچھے چھوڑنا ہوگا جو روشنی کی ہی رفتار

فٹ بال کے بعد دنیا کا سب سے مقبول کھیل

ٹینس

شبنم پروین

پیارے دوستو! ٹینس، فٹ بال کے بعد دنیا کا سب سے مقبول کھیل ہے جس کے چار بڑے سالانہ مقابلے گرینڈ سلیم Grand Slam ٹینس مقابلے کہلاتے ہیں۔ ان کے نام ہیں آسٹریلیا اوپن، فرنچ اوپن، ومبلڈن اور یو ایس اوپن۔ یہ اسی ترتیب میں دنیا کے چار بڑے ملکوں آسٹریلیا، فرانس، انگلینڈ اور امریکہ میں کھیلے جاتے ہیں۔ گرینڈ سلیم کا خطاب اس کھلاڑی کو ملتا ہے جس نے ایک سال میں یا کئی الگ برسوں میں یہ چاروں مقابلے جیت لیے ہوں۔ یہاں یہ بھی جان لو کہ آسٹریلیا اوپن اور یو ایس اوپن ہارڈ کورٹ Hard Court پر کھیلے جاتے ہیں، فرنچ اوپن کلے Clay کورٹ پر ہوتا ہے اور ومبلڈن Wimbledon گراس Grass کورٹ پر یعنی گھاس والے کورٹ پر کھیلا جاتا ہے۔ سب سے پرانا ٹینس مقابلہ بھی یہی ہے جو 1877 میں شروع ہوا تھا۔ اور ہاں کورٹ تو تم سمجھ ہی گئے ہو گے، اس میدان کو کہتے ہیں جس پر ٹینس کھیلا جاتا ہے۔

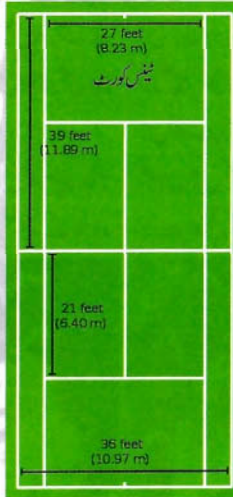


پہلے ٹینس کو لان ٹینس Lawn Tennis کہا جاتا تھا، تاکہ اسے ٹیبل ٹینس سے الگ پہچانا جا سکے۔ اب اسے صرف ٹینس کہتے ہیں۔ مانا جاتا ہے کہ اس کھیل کی شروعات 12 ویں صدی میں فرانس میں ہوئی تھی۔ تب یہ ایک گیند اور ہتھیلی سے کھیلا جاتا تھا۔ بعد میں 16 ویں صدی کے آس پاس ہتھیلی کی جگہ ٹینس کے بلّے Racket نے لے لی اور یہ انگلینڈ میں بھی مقبول ہو گیا۔

ٹینس عام طور دو کھلاڑیوں کے درمیان کھیلا جاتا ہے جسے سنگلز Singles مقابلہ کہتے ہیں۔ دو ٹیموں میں ہونے والا مقابلہ ڈبلز Doubles کہلاتا ہے۔ ٹینس وہ کھیل ہے جس میں خواتین بھی تقریباً شروع سے حصہ لیتی آئی ہیں۔ تاہم ان کے مقابلے الگ ہوتے تھے۔ اب بھی سنگلز خطاب کے میچ الگ الگ ہی ہوتے ہیں لیکن دو ٹیموں والے مکسڈ Mixed ڈبلز مقابلے بھی کھیلے جاتے ہیں جن میں ہر ٹیم ایک مرد اور ایک خاتون کھلاڑی کو ملا کر بنتی ہے۔



اور اب موٹے طور پر یہ سمجھ لو کہ ٹینس کیسے کھیلا جاتا ہے۔ جس میدان پر ٹینس کھیلتے ہیں وہ (دیکھو تصویر میں) چوکور مستطیل (rectangular) نما ہوتا ہے۔ کھیل کے لیے ایک ٹینس بال اور ہر کھلاڑی کے لیے ایک ریکٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کھلاڑیوں کے دائیں بائیں دو ایسے پھرتیلے معاون بھی ہونے چاہئیں جو کورٹ سے باہر چلی جانے والی



گیند اٹھا کر فوراً کھلاڑی کو دے سکیں اور اسے بلا وجہ تھکنے سے بچا سکیں۔ جب گیند کو تھوڑا سا ہوا میں اچھال کر اسے ریکٹ یعنی بلّے کی ضرب سے دوسرے کھلاڑی کی طرف پھینکتا ہے تو یہ پہلی سروس کہلاتی ہے۔اس طرح دوسری طرف پھینکی یا اچھالی گئی گیند کو دوسرا کھلاڑی اپنے بلّے کی ضرب سے واپس پھینکتا ہے اور دونوں کھلاڑی اسی طرح کرتے رہتے ہیں۔ جب کوئی کھلاڑی گیند واپس بھیجنے میں ناکام رہتا ہے تو سروس ٹوٹ جاتی ہے اور جس پر مخالف کھلاڑی کو ضابطے کے مطابق پوائنٹ مل جاتے ہیں۔ اور جس کے پوائنٹ زیادہ رہتے ہیں وہ سیٹ جیت لیتا ہے۔ آخر میں جس کھلاڑی نے زیادہ سیٹ جیتے وہ میچ جیت جاتا ہے۔ لیکن اسکور بننے، سیٹ کتنے ہونے چاہئیں یہ طے کرنے، سروس صحیح ہونے، فاؤل ہونے وغیرہ کے مقررہ ضابطے جاننے کے لیے تمھیں ٹینس کے کسی سینئر کھلاڑی سے سب کچھ سیکھنا ہوگا۔ ہاں ایک بات یہ بھی بتاتے ہیں کہ جسمانی ورزش اور تندرستی کے لیے اس کھیل کو بہت ہی اچھا سمجھا جاتا ہے۔ فلمی اداکار بھی اپنا وزن درست رکھنے کے لیے باقاعدہ ٹینس کھیلتے ہیں۔


امریکہ میں ٹینس: انیسویں صدی کی ایک پینٹنگ

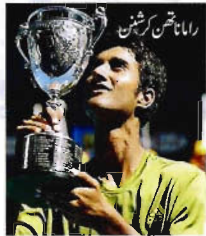


ٹینس دنیا میں سال بھر کھیلا جاتا رہتا ہے۔ گرینڈ سلیم کے علاوہ بھی اس کے کئی عالمی اور علاقائی ٹورنامنٹ ہوتے ہیں، جن میں ڈیوس کپ اور اے ٹی پی ٹور زیادہ مشہور ہیں۔ اسی طرح بہترین ٹینس کھلاڑیوں کی عالمی درجہ بندی بھی پورے سال ہوتی رہتی ہے۔



ہندوستان نے دنیا کو بہترین ٹینس کھلاڑی دیے ہیں، مثلاً رام ناتھن کرشنن، رمیش کرشنن، وجے امرت راج، آنند امرت راج، لیانڈر پیس اور مہیش بھوپتی۔ خواتین میں سب سے زیادہ شہرت ثانیہ مرزا نے پائی ہے۔ راما ناتھن کرشنن پہلے ایشائی کھلاڑی تھے جنھوں نے ومبلڈن میں جونیر، سنگلز کا خطاب جیتا اور 1960 اور 1961 میں ومبلڈن کے سیمی فائنلز تک پہنچ پائے۔ رمیش کرشنن نے 1979 میں جونیئر ومبلڈن چیمپئن شپ جیتی تھی۔ وجے امرت راج کے بہت سے کارناموں میں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے 1984 میں ٹینس کے سب سے زبردست کھلاڑی جان میک این روکو اس کے عروج کے زمانے میں ہرایا تھا اور عظیم کھلاڑی جمی کانرز کو 11 میچوں میں شکست دی۔ انھوں نے ہالی ووڈ کی فلموں میں بھی کام کیا ہے۔ ان کے بڑے بھائی آنند امرت راج بھی اعلی درجے کے ٹینس کھلاڑی رہے ہیں جن کے ساتھ جوڑی بنا کر وہ 1976 میں ومبلڈن کے مین ڈبلز سیمی فائنل میں پہنچے تھے۔ 1974 میں













آنند ڈیوس کپ کی ہندوستانی ٹیم میں بھی شامل رہے جو فائنل تک تو پہنچی مگر وہاں اس کا مقابلہ جنوبی افریقہ کی ٹیم سے تھا جس کا نسل پرستی کی وجہ سے ہندوستانی حکومت نے بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ ہندوستانی ٹیم نے فائنل کھیلنے سے انکار کر دیا اور چیمپئن شپ جنوبی افریقہ کو مفت میں مل گئی۔

لیانڈر پیس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ 1999 میں فرنچ اوپن اور ومبلڈن دونوں کے ڈبلز کے خطاب حاصل کیے جن میں مہیش بھوپتی ان کے جوڑی دار کھلاڑی تھے۔ مہیش بھوپتی اس کے علاوہ 1999 میں یو ایس اوپن مکسڈ ڈبلز کا اور 2006 میں آسٹریلین اوپن کے مکسڈ ڈبلز کا خطاب بھی جیت چکے ہیں۔ اس طرح مہیش بھوپتی چاروں گرینڈ سلیم مقابلوں میں مکسڈ یا ڈبلز جیتنے والے واحد ہندوستانی کھلاڑی ہیں۔



بیون بورگ

ثانیہ مرزا پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جنھوں نے 2005 میں ڈبلیو ٹی اے کا سنگلز خطاب حاصل کیا۔ کسی گرینڈ سلیم مقابلے کے چوتھے راؤنڈ تک پہنچنے والی بھی وہ پہلی ہندوستانی خاتون ہیں اور یہ کارنامہ انھوں نے 2005 کے آسٹریلیا اوپن میں انجام دیا تھا مگر سیرینا ولیمز سے ہار جانے کی وجہ سے وہ آگے نہ بڑھ سکیں۔

دنیا کے سب سے بڑے ٹینس کھلاڑیوں میں ہم روڈ لیور Rod Laver (آسٹریلیا)، بیون بورگ Borg Bjorn (سویڈن) پیٹ سیمپراس Pete Samras (امریکہ) راجر فیڈرر Roger Federer (سوئٹزر لینڈ) جان میک این رو John McEnroe



(امریکہ) جمی کانرس Jimmy Connors (امریکہ) رافیل ناڈال Rafael Nadal (اسپین) آندرے اگاسی Agassi Andre (امریکہ) اور بورس بیکر BeckerBoris (جرمنی) کے نام لے سکتے ہیں۔ خواتین میں آج سیرینا ولیمس Serena Williams (امریکہ) تاریخ کی سب سے بڑی ٹینس کھلاڑی مانی جارہی ہیں لیکن جسٹن ہینن Justine Henin (بلجیم) ایون گلاگونگ Evonne Goolagong وینس ولیمس Venus Williams، مونیکا سیلیس SelesMonica (یوگوسلاویہ) بلی جین کنگ Billie Jean King (امریکہ) مارگریٹ کورٹ Margaret Court (آسٹریلیا) کرس ایورٹ Chris Evert (امریکہ) اسٹفی گراف Steffi Graf، مارٹینا ناوراتلوو Martina Navratilova (چیکو سلواکیہ) بھی کچھ کم نہیں رہیں۔ ان سب میں ایسی ایسی خوبیاں تھیں اور ہیں کہ ہر کھلاڑی کے لیے الگ سے مضمون لکھنا پڑے گا۔ لہٰذا تم ان کے بارے میں انٹرنیٹ سے یا کھیل سے متعلق رسالوں کو پڑھ کر معلومات حاصل کرو اور دیکھو کہ ان لوگوں نے کیسے کیسے کارنامے انجام دے کر ٹینس کو دنیا کا مقبول ترین کھیل بنایا ہے۔ ہو سکے تو خود بھی یہ کھیل کھیلو۔



■ Shabnam Parveen , C280, Shaheen Bagh , New Delhi-110025

■ شمیم احمد صدیقی

اپنا امتحان خود لیجئے

اگر آپ چھ منٹ میں اِن سوالوں کے جواب بتادیتے ہیں تو خود کو عام معلومات میں ہی نہیں، اردو لکھنے پڑھنے میں بھی 'ہوشیار' کہہ سکتے ہیں۔ شرط بس یہ ہے کہ آپ کو سال کے تمام بارہ انگریزی مہینوں کے نام ٹھیک طرح یاد ہونے چاہئیں۔ تو پھر دیر کس بات کی، کاغذ پنسل اٹھایئے، گھڑی میں وقت نوٹ کیجئے، جواب لکھئے اور انھیں اسی صفحے پر دیے گئے صحیح جوابات سے ملا کر دیکھئے کہ آپ واقعی 'ہوشیار' ہیں یا نہیں! ادارہ

June 2013

سوالات:

(1) وہ کون سا مہینہ ہے جس کے نام کے تمام حروف بغیر نقطہ والے ہیں۔

(2) ان دو مہینوں کے نام بتائیں جو ایسے حروف سے شروع ہوتے ہیں جو کسی اور مہینے کے نام میں نہیں آتے۔ ان میں ایک مہینے کی پچیس تاریخ کو تمام اسکول کالجوں میں تعطیل رہتی ہے اور دوسرا سال کا سب سے چھوٹا مہینہ ہوتا ہے۔

(3) وہ کون سا مہینہ ہے جس میں تمام سرکاری ملازمین کام تو کم کرتے ہیں لیکن پھر بھی سرکار ان کو پورے مہینے کی تنخواہ دیتی ہے۔ اگر اس کے نام کے پہلے حرف کو 'ض' سے بدل دیں تو ہم کو اپنا ضروری کام یاد آجاتا ہے۔

(4) اس مہینے کا نام بتائیں جس کے چار حرفی نام کا آخری حرف تین نقطوں والا ہے۔

(5) وہ کون سا مہینہ ہے جس کا نام 'الف' سے شروع ہوتا ہے اور اس میں کل تیس دن ہوتے ہیں۔

(6) 'الف' سے شروع ہونے والے اس مہینے کا نام بتائیں جس کی اکیس تاریخ کو ہندوستان کی پہلی خاتون وزیر اعظم شہید ہوئی تھیں۔ اسی مہینہ کی سترہ تاریخ کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خاں کی پیدائش ہوئی تھی۔

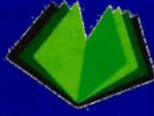
(7) اس مہینے کا نام بتائیں جس کے تین حرفی نام کا پہلا اور آخری حرف ایک نقطہ والا ہے۔

(8) وہ کون سا مہینہ ہے جس کے نام میں 'ر' نہیں ہے اور اس کا ایک دن قومی تیوہار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ویسے 'ر' سے محروم تین مہینے اور بھی ہیں، جو اس مہینے سے پہلے لگاتار آتے ہیں۔

(9) اس پانچ حرفی مہینے کا نام بتائیں جس کے دو حروف ایک نقطہ والے ہیں اور اس مہینے کی ایک رات میں تمام ملک میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ اس کا دن قومی تیوہار کے طور پر منایا جاتا ہے۔

صحیح جواب: (1) مئی، (2) دسمبر، فروری (3) فروری، (4) مارچ، (5) اپریل، (6) اکتوبر، (7) جون، (8) اگست، (9) جنوری

اردو Facebook



پیارے دوستو، یہ اردو فیس بک صرف اور صرف آپ کے لیے ہے۔ جو کچھ آپ اپنے آس پاس اچھا یا برا دیکھتے ہیں، کسی سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، کسی سے کوئی دل چسپ بات سنتے ہیں، کوئی لطیفہ یا کوئی معلوماتی بات پڑھتے ہیں، یا پھر آپ کے گھر میں کوئی دل چسپ واقعہ ہوتا ہے تو اسے ہمارے ساتھ شیئر Share کیجیے۔ ہم اسے آپ کی تصویر کے ساتھ چھاپ دیں گے تاکہ دوسرے بھی آپ کی باتوں کا مزا لے سکیں۔ اچھا یہ ہوگا کہ آپ اپنی بات خود اپنے ہاتھ سے لکھیں۔ املے یا جملے کی غلطی سے بالکل نہ گھبرائیں، ہم اسے ٹھیک کر کے ہی چھاپیں گے۔ تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ اٹھائیے قلم اور لکھ ڈالیے اپنے دل کی باتیں! اپنے خط کو اسکین Scan یا کمپوز کر کے اپنی تازہ ترین تصویر کے ساتھ آپ ہمیں اس شمارے کے پہلے صفحے پر دیے گئے ای میل آئی ڈیز یا ڈاک کے پتے پر بھیج سکتے ہیں۔ مدیر



میں البرکات پبلک اسکول، علی گڑھ کی دسویں کلاس میں پڑھتی ہوں۔ خود کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ مجھے اردو کا ماحول ملا۔ میرے خاندان میں ہر طرف اردو کا چرچا ہے۔ بہت سارے ادیب اور شاعر ہیں میرے خاندان میں۔ شاید اسی لئے میرے امی اور ابا نے ایسے اسکول (البرکات پبلک اسکول، علی گڑھ) میں میرا داخلہ کرایا جہاں پہلی کلاس سے ہی انگلش اور ہندی کے ساتھ ساتھ اردو بھی لازمی ہے۔ اب میں تین زبانیں یعنی اردو، انگلش اور ہندی پڑھ رہی ہوں۔ قرآن شریف بھی میں نے کئی سال پہلے ختم کرلیا ہے۔ اگر مجھے اردو نہ آتی تو میں اپنی دادی سیدہ فرحت کی شاعری کس طرح پڑھ پاتی۔ میری نانی نرجس خاتون مجھے میری دادی کے لکھے قصیدے اور سلام لکھ لکھ کر بچپن سے پڑھواتی رہیں، اور تلفظ درست کراتی ہیں۔ اسکول کے پروگراموں میں مجھ سے خاص طور پر اردو نظمیں پڑھوائی جاتی ہیں۔ میری دو چھوٹی بہنیں، ثنا اور رباب بھی اردو پڑھ رہی ہیں۔

میرے گھر میں بہت سی اردو کی کتابیں ہیں۔ بچپن سے میری دادی مرحومہ، امی اور ابا اور پھپھو اردو کی کہانیاں پڑھ کر سناتی تھیں۔ اب میں خود بھی آسانی سے اردو پڑھ لکھ سکتی ہوں۔ مجھے مجلسوں میں نوحے پڑھنے کا شوق ہے لیکن نانی اور پھپھو نے کہا کہ نوحوں کی بیاض بنانا ہے تو اردو میں ہی لکھنا ہوگا۔ میں نے پچھلی گرمی کی چھٹیوں میں پہلے سارے نوحے، کاپی پر لکھے اور پھر ابا نے، اس میں جو غلطیاں تھیں، ٹھیک کیں اور پھر میں نے اپنی بیاض میں وہ نوحے خوش خط لکھ لیے ہیں۔ اور ہاں ابا مجھے دلاور فگار کی شاعری پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ ان کی بہت سی نظمیں میں نے زبانی یاد کر لی ہیں۔

اریبہ حسین، البرکات پبلک اسکول، علی گڑھ



میرا نام حرا تبسم ہے۔ ابھی درجہ دوئم میں پڑھتی ہوں اور اردو

چھٹی کلاس میں ناول لکھنے والی لڑکی



دارالغیاث، سبزی باغ، پٹنہ۔۴ میں رہنے والی دبلی پتلی معصوم سی تشیطہ جاوداں، الحرا پبلک اسکول، شریف کالونی، پٹنہ میں چھٹے درجے کی طالبہ ہے۔ مگر اس نے صرف سات دنوں میں لگ بھگ سوا سو صفحوں کا ایک جاسوسی ناول بعنوان Mystery of the Hidden Treasure (چھپے خزانے کا راز) لکھ کر سب کو چونکا دیا ہے۔
حیرت کی بات یہ ہے کہ تشیطہ نے ناول لکھنے میں کسی سے ایک لفظ کی مدد نہیں لی۔ ان دنوں وہ بیمار تھی اور اسکول نہیں جا رہی تھی۔ دسمبر کی سخت سردی میں نماز فجر کے بعد وہ لحاف کے اندر چھپ کر ناول لکھتی رہی اور گھر والے سمجھتے رہے کہ وہ اسکول کی پڑھائی کر رہی ہے۔ تشیطہ کے انگریزی ناول کا پلاٹ، اس کے کرداروں کا بیان، مکالمے، منظر کشی، اور کہانی کہنے کے خوب صورت انداز کو دیکھنے سے لگتا ہی نہیں ہے کہ یہ ایک بچی نے لکھا ہے۔ دراصل تشیطہ کو قصے کہانیوں کا شروع سے شوق تھا۔ وہ دوسرے درجے سے اردو کتابوں کے ساتھ انگریزی ماہنامہ چمپک اور میجک پوٹ وغیرہ پڑھنے لگی تھی۔ اس کے بعد انگریزی جاسوسی ناول پڑھنے لگی۔ نینسی ڈریو Nancy Drew اور ہیری پوٹر Harry Potter کی سیریز پڑھی۔ دو بڑی بہنیں انیقہ جاوداں اور لطیفہ جاوداں سینٹ جوزف کانونٹ میں پڑھتی ہیں۔ جب بھی وہ اسکول لائبریری سے کوئی ناول لاتیں، تشیطہ ان سے ناول جھپٹ لیتی اور جلدی سے پڑھ کر لوٹا دیتی۔ بہنیں تعجب سے پوچھتیں کہ اتنی جلدی پڑھ لی؟ تو وہ جواب میں مسکرا دیتی۔ وہ صرف انگریزی میں نہیں لکھتی۔ اردو سے بھی اسے محبت ہے۔ اسے کئی شاعروں، خاص طور پر علامہ اقبال کے بہت سے اشعار یاد ہیں۔ اس کے والد ڈاکٹر اسلم جاوداں، اردو کی ایک تنظیم 'اردو کونسل ہند' کے بڑے عہدیدار ہیں، جو اردو زبان کو پورے بہار میں پھیلانے کے کام میں جٹی ہے۔ تشیطہ نے اردو میں اپنی پہلی کہانی 'نیکی کا صلہ' اس وقت لکھی تھی جب وہ پہلی جماعت میں پڑھتی تھی۔ اُسے اس کے اسکول نے ناول لکھنے پر ایک جلسہ کر کے انعام سے نوازا ہے۔ **مرسلہ**: احمد علی خازن، الھند ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، برلا مندر روڈ، پٹنہ۔ بہار

پڑھنا سیکھ رہی ہوں۔ مجھے بچوں کی دنیا کے بارے میں معلوم ہوا۔ یہ ہم سب کے لیے خوشی کی بات ہوگی۔ مجھے رسالے کا بے صبری سے انتظار ہے۔ ہمارے گھر میں میرے ممی پاپا اردو کا رسالہ خریدتے ہیں اور 'اردو دنیا' بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ میں ابھی اس رسالے کو ٹھیک طرح سے نہیں پڑھ سکتی لیکن اس کی تصویریں اور رنگینی دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ بہت اچھا رسالہ ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ رسالہ 'بچوں کی دنیا' بھی سب کو اچھا لگے گا۔

حرا تبسم C-183 تھرڈ فلور، شاہین باغ، اوکھلہ، نئی دہلی



ڈیر انکل، میں اردو پڑھتی ہوں، اور مجھے اردو زبان بہت اچھی لگتی

ہے۔ رسالہ 'اردو دنیا' میں بچوں کے لیے شروع ہونے والے رسالے کی خبر پڑھی۔ بے حد مسرت ہوئی اور انتظار کرنے لگی۔ کاش کہ رسالہ 'بچوں کی دنیا' جلد از جلد ملے اور پڑھوں۔ تسلیمات

رانیہ خان A-187/3، دوسری منزل شاہین باغ، نئی دہلی 25



اردو دنیا میں بچوں کے لیے نکلنے والے رسالہ 'بچوں کی دنیا' کی خبر پڑھ کر انتہائی مسرت ہوئی۔ اب ہم 'بچوں کی دنیا' کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ خدا جانے کب یہ رسالہ آنکھوں کو روشنی بخشے گا۔ والسلام

سیماب رضی A-187/3، دوسری منزل شاہین باغ، نئی دہلی 25



میرے اسکول میں اردو ہے

مدیر انکل! آداب، میرا نام سماویہ احسان ہے۔ امید کرتی ہوں کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کی جانب سے یہ اطلاع سن کر بے حد مسرت ہوئی کہ آپ ہم سب بچوں کے لیے ایک رسالہ 'بچوں کی دنیا' شائع کرنے جارہے ہیں۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' کا انتظار ہے۔ میں اردو پڑھنا سیکھ رہی ہوں اور الف سے ی تک پڑھنا بھی آگیا ہے۔ میرے اسکول میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے۔ شکریہ

سماویہ احسان، معرفت، احسان احمد خاں C Block، کولیسرا، گریٹر نوئیڈا، گوتم بدھ نگر، اتر پردیش



میری اردو ابھی کچّی ہے

محترم، میں اردو کے رسالے اور اخبار پڑھتی کم ہوں اور ان کے ورق زیادہ الٹتی ہوں۔ مجھے ابھی اردو بہت زیادہ سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن اس زبان میں اتنی مٹھاس ہے کہ اسے سیکھنے اور پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ اتفاقاً ایک دن 'اردو دنیا' پر نظر پڑی جس میں لکھا تھا کہ قومی کونسل 'بچوں کی دنیا' کے نام سے ایک میگزین شائع کرنے جارہا ہے۔ بہت خوشی ہوئی اب اس میگزین کو دیکھنے اور پڑھنے کا انتظار ہے۔

ثنا آفرین، غفار منزل، نئی دہلی 25



ہمارے گھر اردو اخبار آتا ہے

مجھے اردو زبان سے بہت پیار ہے، ہمارے گھر میں سبھی کو اردو اچھی آتی ہے، اردو ہی میں سب ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں اور گھر پر تو ہمارے ابو روزانہ اردو اخبار ہی پڑھتے ہیں، ابو کے ساتھ میں بھی اردو کا اخبار دیکھتا رہتا ہوں اور ابو کے گھر موجود نہ رہنے پر گھر پر کتابیں اور میگزین الٹتا پلٹتا رہتا ہوں انھی دنوں ایک دن ماہنامہ 'اردو دنیا' پر نظر پڑی، جس میں لکھا تھا کہ اب کونسل بچوں میں اردو کے دلچسپی جگانے کے لیے 'بچوں کی دنیا' کے نام کی ایک میگزین شائع کرے گی۔ امید ہے جلد ہی یہ میگزین دیکھنے اور پڑھنے کو ملے گی۔

محمد حمدان مکان نمبر 88، غفار جامعہ نگر، نئی دہلی 25



میں 'اردو دنیا' کے ورق پلٹتی رہتی ہوں

'اردو دنیا' کے شمارے میں یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ قومی اردو کونسل بچوں کے لیے ایک خاص رسالہ 'بچوں کی دنیا' نکال رہی ہے۔ یوں تو گھر میں 'اردو دنیا' کے ورق پلٹتی رہتی ہوں اور تصاویر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی اس میں چھپتا ہے وہ اچھا ہی ہوتا ہوگا۔ یہ جان کر دوگنی خوشی ہوئی کہ اب ہمارے لیے ایک رسالہ شروع ہورہا ہے۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' کا انتظار ہے۔

سارہ فاطمہ، پٹنہ سٹی، پٹنہ



میرے گھر پر اردو رسالے آتے ہیں

میں تیسری کلاس انگلش میڈیم میں پڑھتی ہوں لیکن میرے گھر پر بہت سے اردو کے رسالے آتے ہیں۔ کبھی کبھار میں انھیں بھی الٹتی پلٹتی رہتی ہوں۔ کبھی کوئی چیز اچھی لگی تو پڑھ بھی لیتی ہوں۔ اچانک ایک دن میری نظر 'اردو دنیا' پر پڑی۔ جس میں ایک اشتہار 'بچوں کی دنیا' کے تعلق سے پڑھا۔ اب مجھے 'بچوں کی دنیا کا' انتظار ہے۔

الویرا نظر، C-82، کریلی کالونی، جی ٹی بی نگر، الہ آباد



میں اردو آسانی سے پڑھ لیتی ہوں

انکل، میرے گھر میں شروع سے ہی اردو ادب و زبان کا ماحول رہا ہے۔ ابو اور امی نے مجھے اردو زبان کی تعلیم دی ہے اور میں اردو آسانی سے پڑھ لیتی ہوں۔ اردو میں بچوں سے متعلق چیزیں کم ہوتی جارہی ہیں۔ قومی اردو کونسل کے رسالے 'اردو دنیا' کے ذریعہ اس خبر سے بہت خوشی ہوئی کہ اب بچوں کے لیے ایک خصوصی رسالہ شائع ہونے جارہا ہے۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' کا بے صبری سے انتظار ہے۔

ثنا فاطمہ، اسپرنگ ڈیلز اسکول، نئی دہلی



مجھے ابّو سے معلوم ہوا ہے...

انکل آداب، کیسے ہیں آپ؟ مجھے ابو سے معلوم ہوا ہے کہ اب ہم بچوں کے لیے بھی ایک رسالہ 'بچوں کی دنیا' شائع ہونے جارہا ہے۔ یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کیونکہ میں اردو آسانی سے پڑھ لیتی ہوں۔ مجھے بچوں کی دنیا کا انتظار ہے۔ پتہ ہے انکل، میرے ابو مجھے 'اردو دنیا' نہیں پڑھنے دیتے، کہتے ہیں کہ پھٹ جائے گی۔ اب بچوں کی دنیا آئے گی نا تو میں انہیں نہیں دیکھنے دوں گی۔ بس اب جلدی سے چھاپ دیں اور میرے دعا بھی کریں۔

عزکیہ عارفی، جنک پوری، دہلی



مجھے امید ہے یہ الگ طرح کا رسالہ ہوگا

مدیر انکل، سلام علیکم، امید کرتا ہوں کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آخر آپ کو ہمارا خیال بھی آ ہی گیا اور آپ نے ہمارے لیے خاص طور سے ایک رسالہ شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ ہم سب بچوں کے لیے نہایت خوشی کا مقام ہے۔ آپ کے یہاں سے چھپنے والا رسالہ اردو دنیا دیکھتا ہوں۔ اب بچوں کی دنیا کا انتظار ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ بچوں کے لیے ایک الگ طرح کا رسالہ ہوگا۔

نواز وارثی خاں، رینوکوٹ، اتر پردیش



میں نے 'اردو دنیا' پڑھنا چھوڑ دیا تھا

ایڈیٹر صاحب آداب، 'اردو دنیا' میں 'بچوں کا گوشہ' میں ہمیشہ پڑھتی تھی، مگر پھر یہ گوشہ آنا بند ہوگیا تو میں نے 'اردو دنیا' پڑھنا چھوڑ دیا۔ اب سنا ہے کہ آپ 'بچوں کی دنیا' کے نام سے الگ میگزین نکال رہے ہیں۔ جب سے سنا ہے، میری خوشی کا ٹھکانا نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں انگریزی میگزین Tell Me Why اور Wisdom کی طرح اس میں بھی کچھ حصہ شامل کیا جائے۔ میں بے صبری سے انتظار کررہی ہوں۔

ترانہ سحر، درجہ 5 سینٹرل اکیڈمی سینئیر سیکنڈری اسکول لکھنؤ، یوپی



میں گھر پر اردو پڑھ رہی ہوں

میرے دادا ابّا خواجہ عبدالمنتقم نے مجھے بتایا کہ آپ 'بچّوں کی دنیا' شروع کررہے ہیں۔ مبارک ہو۔ میری والدہ نے ایک دن بتایا تھا کہ ایک مرتبہ ایک بزرگ عورت کسی مریض کی 'عیادت' کرنے یعنی اسے دیکھنے گئیں اور انھوں نے کہہ دیا کہ میں آپ کی 'تعزیت' کے لیے آئی ہوں۔ اس پر مریض نے کہا ابھی تو میں زندہ ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ ایسی غلطیاں مجھ سے ہوں اس لیے گھر پر اردو پڑھ رہی ہوں۔ امید ہے 'بچّوں کی دنیا' سے میری اردو اور بہتر ہو سکے گی۔

علیزا ذیشان، درجہ سات، لیڈی ارون اسکول، نئی دہلی